مروّجہ اسلامی بینکاری' حیلہ سازی اور شرعی تعلیمات

عصر حاضر میں مسلم دنیا کو جو چیلنجز درپیش ہیں' ان میں سے ایک بڑا چیلنج اقتصاد و معیشت کے باب میں بینکنگ سے متعلق ہے۔ یہود کے سودی چنگل میں جکڑے ہوئے اس نظامِ بینکاری کا اثر و نفوذ دنیا کے ہر خطے میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مسلم ریاستیں اس کے استحصالی ہتھکنڈوں کا خصوصی ہدف ہیں۔ علاوہ ازیں قومی و بین الاقوامی سطح پر تجارت اور لین دین میں بھی بینکوں کا کردار اس قدر بنیادی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ اس سے پہلو بچانا ممکن نہیں رہا۔ اندریں حالات علمائے اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کا قابل عمل اور شافی حل پیش کریں۔ یہاں یہ نکتہ بطور خاص پیش نظر رہے کہ معیشت اجتماعی نظامِ زندگی کا ایک جزء ہے' کُل نہیں۔ لہٰذا پورے نظامِ حیات کو اسلام کے مطابق ڈھالے بغیر محض بینکاری کو پورے طور پر اسلامی بنانا ممکن نہیں۔ تاہم اس کے باوجود عارضی بنیادوں پر اس سلسلے میں انفرادی و اجتماعی طور پر کافی کوششیں ہوئیں اور یوں اسلامی بینکاری کا رواج شروع ہوا۔

اسلامی بینکاری کے عملی تجربات مختلف مسلم ریاستوں میں گزشتہ چار' پانچ عشروں سے جاری ہیں۔ اس کے نظریاتی پہلوؤں پر بحث و تمحیص کا سلسلہ بھی اتنا ہی قدیم ہے۔ مروّجہ اسلامی بینکاری کے حق میں دیے جانے والے دلائل زیادہ تر حیلوں پر مبنی ہونے کی بنا پر کافی کمزور نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ علم کی عظیم اکثریت اس حوالے سے بہت سے تحفظات رکھتی ہے۔ وطن عزیز کے بعض رسائل و جرائد میں ان دنوں مروّجہ اسلامی بینکاری کے جواز اور عدم جواز پر گرما گرم بحث مباحثہ جاری ہے۔ اسی تناظر میں حال ہی میں مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علمائے احناف کی ایک بڑی تعداد کا ایک متفقہ فتویٰ کراچی سے جاری ہوا ہے' جس میں مرقوم ہے:

> ''مروّجہ اسلامی بینکاری کی غیر اصلی اور عارضی بنیادیں چونکہ مرابحہ و اجارہ ہیں' ان عارضی بنیادوں پر بینکاری کرنے کو اور ان عارضی حیلوں کو مستقل ذریعہ تمویل بنانے کو اسلامی بینکاری کہنا اور سمجھنا شرعاً و اخلاقاً جائز کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں:
>
> ا۔ غیر اصلی بنیادیں (مرابحہ و اجارہ) محض حیلے ہیں اور حیلوں کو مستقل نظام بنانا ناجائز ہے' ایسے حیلوں کے ذریعے انجام پانے والا معاملہ بھی ناجائز ہی کہلاتا ہے۔ جیسے امام محمدؒ کے ہاں 'بیع عینہ' کا

حیلہ ناجائز ہے۔اسی طرح مرابحہ واجارہ کے حیلے اوران کو ذریعہ تمویل بنانا بھی ناجائز ہے...

۲۔یہ حیلے صرف مخصوص حالات اور وقتی عبوری دور کے لیے علماء نے بتائے تھے۔

۳۔یہ بہت ہی نازک اور خطرناک حیلے ہیں' ذراسی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملادیتی ہے۔

۴۔ان حیلوں کو دائمی نظام کے طور پر استعمال کرنا نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ ناجائز بھی ہے۔

۵۔اسلامی بینکاری میں مرابحہ اور اجارہ کا حجم ختم ہونا ضروری ہے' ورنہ کوئی اسلامی بینک ''اسلامی بینک'' کہلانے کا حقدار نہیں ہوگا' بلکہ ''حیلہ بینک'' کہلانے کا بجا طور پر حقدار ہوگا۔''

(مروجہ اسلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اور مفتیان عظام کا متفقہ فتویٰ: ص۳' ۴)

آٹھ صفحات پر مشتمل اس مفصل فتوے کی بعد میں پریس ریلیز بھی جاری کی گئی' جس میں یہ کہا گیا کہ مروجہ اسلامی بینکاری قطعی غیر شرعی اور غیر اسلامی ہے۔اسلام کی طرف منسوب بینکوں کا بھی وہی حکم ہے جو دیگر سودی بینکوں کا ہے۔اس اجلاس میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے حضرت مفتی حمید اللہ جان صاحب' جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے حضرت مولانا مفتی عبد المجید دین پوری صاحب' حضرت مولانا مفتی رفیق احمد صاحب اور حضرت مولانا مفتی شعیب عالم صاحب' جامعہ فاروقیہ سے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب' مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب' حضرت مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب' حضرت مولانا مفتی احمد خان صاحب' جامعہ اسلامیہ کلفٹن سے حضرت مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب' خیر المدارس ملتان سے مفتی مولانا عبداللہ صاحب' دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے حضرت مفتی غلام قادر صاحب' جامعہ خلفائے راشدین کراچی سے حضرت مفتی احمد ممتاز صاحب' جامعہ احسن العلوم کراچی سے حضرت مفتی زرولی خان صاحب' جامعہ رشیدیہ بلوچستان سے حضرت مولانا مفتی احتشام الحق آسیا آبادی صاحب وغیرہ نے شرکت کی ہے۔

اسلامی بینکوں کے کاروبار کی معروف اور مروج شکلوں پر تفصیلاً نقد وتبصرہ پر مشتمل ایک تحقیقی مضمون حکمت قرآن کے آئندہ شمارے میں پیش کیا جائے گا' اِن شاء اللہ۔سردست ہم اتنا عرض کرنا مناسب خیال کرتے ہیں کہ اسلامی بینکوں کا مروجہ نظام اکثر وبیشتر غیر شرعی حیلوں پر مشتمل ہے' جس میں بظاہر جزءًا جزءًا اسلامی قوانین کی پابندی ہو رہی ہے' لیکن ان قوانین کے جاری کرنے سے شریعت کی روح اور مقاصد بری طرح پامال ہو رہے ہیں۔غیر سودی بینک ہوں یا سودی بینک ہوں' دونوں طرح کے بینک حقیقت میں تجارت وکاروبار نہیں کرتے بلکہ پیسوں کا لین دین کرتے ہیں۔لہٰذا اسلامی بینکوں کے ساتھ ہاؤس فنانسنگ' کارلیزنگ اور بیع مرابحہ کرنا متذکرہ بالا فتوے کی رو سے ناجائز قرار پاتا ہے اور ان بینکوں میں کوئی بچت اکاؤنٹ کھلوانا بھی اسی زمرے میں آتا ہے۔چنانچہ احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ جب تک بینک اپنی ماہیت ہی کو تبدیل نہ کرلیں اور واضح طور پر حقیقی کاروباری ادارے نہ بن جائیں ان بینکوں کے مشکوک نوعیت کے لین دین سے اجتناب کیا جائے۔

آیۂ نور کی تفہیم کے دو انداز

عدنان رحمٰن / ترجمہ: سید افتخار احمد

سورۃ النور میں آیات ۳۵ تا ۴۰ نے تاریخ اسلامی کے مختلف اَدوار میں نامور اہل علم کو دعوتِ فکر دی ہے۔ متقدمین میں امام غزالیؒ نے ان آیات کی تشریح و توضیح میں ایک پوری تصنیف ''مشکوٰۃ الانوار'' کے نام سے تحریر کی، جس کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے اور ایچ ٹی گیرڈنر نے غالباً پہلی بار انگریزی زبان میں ترجمہ کر کے ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ جناب محمد عدنان ہارون رحمٰن کی گریجویشن سطح کی تعلیم کمپیوٹر سائنس میں امریکہ میں ہوئی جہاں وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے دروس قرآنیہ کے ذریعے فکر اسلامی اور تجدید و احیائے اسلام سے روشناس ہوئے۔ بعد ازاں وہ کچھ عرصہ لاہور آ کر قرآن اکیڈمی میں سکالر کی حیثیت سے متعلق رہے اور بالخصوص شعبہ انگریزی کے تحت انہوں نے ڈاکٹر صاحب کے چند کتابچوں کے انگریزی میں ترجمے کیے جو انجمن خدام القرآن نے شائع کیے ہیں۔ عدنان رحمٰن کی علمی پیاس انہیں کشاں کشاں ملائشیا کی اسلامی یونیورسٹی لے گئی جہاں انہوں نے ڈاکٹر سید نقیب العطاس کے انسٹی ٹیوٹ سے ایم اے کی ڈگری لی۔ اور اب موصوف مزید اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ میں مقیم ہیں۔ مضمون ہٰذا انہوں نے انگریزی میں لکھا اور وہیں IONA کے سہ ماہی پرچے SIGNS میں شائع ہوا۔ ہم اس کا اردو ترجمہ قارئین حکمت قرآن کی خدمت میں اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ مصنف نے اسے محولہ بالا آیاتِ سورۂ نور کی تشریح کے دو انداز کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ ترجمے میں قصداً فلسفے کی فنی اصطلاحات سے گریز کر کے اسے زیادہ سے زیادہ عام فہم بنایا گیا ہے۔ قارئین بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امام غزالیؒ کے فکر میں یونانی نوفلاطونی تنزلات کے افکار کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی ہے۔ غالباً غزالیؒ فلسفہ و فکر عقلی کا رد کرنے کے باوجود اس کے چنگل سے نہ بچ نکل سکے (کم از کم مشکوٰۃ الانوار کے مشمولات کی حد تک)، جبکہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تفسیر و تشریح جمہور مفسرین کے مطابق قرآن و احادیث نبویہ کے محکمات پر مبنی ہے۔ اُمید ہے قارئین اس مضمون کو ایک سکالر کی کاوش کی حیثیت سے کھلے دل کے ساتھ پڑھیں گے۔ (ابصار احمد)

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ ۙ يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ ؕ نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ ؕ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝﴾ ..... ﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ كَسَرَابٍ بِقِيْعَةٍ يَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْئًا وَّوَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ ؕ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ اَوْ كَظُلُمٰتٍ فِيْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ يَّغْشٰىهُ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ مَوْجٌ مِّنْ فَوْقِهٖ سَحَابٌ ؕ ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ ؕ اِذَآ اَخْرَجَ يَدَهٗ لَمْ يَكَدْ يَرٰىهَا ؕ وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ ۝﴾

''اللہ ہی آسمانوں اور زمین کی روشنی ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسے ہے جیسے ایک طاق ہو اس میں ایک چراغ ہو، چراغ ایک شیشے (فانوس) میں ہو اور وہ شیشہ ایک چمک دار ستارے کی مانند روشن ہو، وہ چراغ جلتا ہو ایک ایسے مبارک زیتون کے درخت (کے تیل) سے جو نہ شرقی ہو نہ غربی، اس کا روغن بھڑک اٹھنے کو بے تاب ہو، خواہ اسے آگ نے چھوا تک نہ ہو۔ یہ روشنی ہے روشنی پر۔ اللہ ہدایت دیتا ہے اپنے نور کی جانب جس کو چاہتا ہے۔ اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لیے اور اللہ تو سب کچھ جاننے والا ہے۔ (یعنی وہ ہر شے کی حقیقت سے کماحقہٗ واقف ہے!)

.....اور جن لوگوں نے کفر کیا ان کے اعمال ایسے ہیں جیسے دشتِ بے آب میں سراب (یعنی دھوپ میں چمکتی ہوئی ریت) جسے پیاسا پانی سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچتا ہے تو نہیں پاتا اسے کچھ بھی، البتہ اللہ کو اپنے پاس موجود پاتا ہے جو اُس کا پورا پورا حساب چکا دیتا ہے۔ اور اللہ کو حساب چکاتے دیر نہیں لگتی۔ یا اُن اندھیروں کے مانند جو کسی گہرے سمندر میں ہوں جنہیں ڈھانپے ہوئے ہو موج اور اس کے اوپر ایک اور موج اور اس پر (سایہ کیے) ہوں بادل۔ (گویا) تاریکیاں ہیں تہہ بر تہہ۔ جب وہ اپنا ہاتھ نکالتا ہے تو اسے بھی نہیں دیکھ پاتا۔ اور جسے اللہ ہی روشنی عطا نہ فرمائے تو اس کے لیے کوئی روشنی نہیں!''

اللہ تعالیٰ کا ہر لفظ روشنی کی ایک شعاع ہے جس کی قوسِ قزح میں لامحدود رنگ پوشیدہ ہیں۔ جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا﴾ (الکھف)

''کہہ دیجیے اگر سمندر سیاہی بن جائے میرے پروردگار کی باتوں کے واسطے تو سمندر لازماً خشک ہو جائے پیشتر اس کے کہ میرے رب کی باتیں پوری ہوں اگرچہ اس کی مدد کو ہم ایک اور سمندر اسی طرح کا لے آئیں۔''

اسی وجہ سے مسلمان صوفیاء نے قرآن مجید کے ایک ہی ٹکڑے کی بے شمار توضیحات پیش کی ہیں۔ ہر ایک وضاحت لفظِ الٰہیہ کے سمجھنے کے لیے اس کے مخفی لامحدود طریقوں میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف علماء نے کلامِ الٰہی کے ایک ہی لفظ سے مختلف بصائر حاصل کیے ہیں۔ اور یہ ہر شخص کی ذہنی استعداد کے مطابق ہے جو اس کی تعلیمی حالت، خاندانی پرورش، ثقافتی ماحول، عمر کے مطابق تجربہ، ذاتی مزاج، بلکہ گروہی اثر، مختصر یہ کہ انسان کی پوری زندگی کے تجربات کے نچوڑ پر منحصر ہے۔

اب ہم قرآن مجید کی مشہور آیت النور کی دو مختلف توضیحات کا جائزہ لیں گے۔ ساتھ ہی سورۃ النور کی ۳۵ تا ۴۰ آیات کا بھی بیان ہوگا۔ یہ دونوں توضیحات تاریخ کے دو مختلف اَدوار کے عالموں کی ہیں جو ایک دوسرے کے قریباً ایک ہزار سال کے فرق سے پیدا ہوئے۔ نتیجتاً دونوں مختلف ماحول و حالات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک ہیں ابو حامد الغزالیؒ اور دوسرے ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ۔

ابو حامد الغزالیؒ کی توضیح

الغزالیؒ (۴۵۰ھ/۱۰۴۸ء تا ۵۰۵ھ/۱۱۱۱ء) طوس، خراسان موجودہ ایران میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنے وقت کے تمام سائنسی مضامین، فقہ اسلامی، تصوف اور یونانی فلسفہ پر عبور حاصل کیا۔ تصوف اور یونانی فلسفہ میں ایک نظریہ مشترک ہے کہ ہر چیز کا ایک باطنی پہلو بھی ہے جو صرف ان حضرات کے علم میں آتا ہے جو اس راہ پر گامزن ہوں اور عوام الناس سے مختلف ہوں، یعنی یونانی فلاسفر اور مسلم صوفی۔ الغزالیؒ زیادہ تر فلاسفی پر اعتراض کے لیے مشہور ہیں، حالانکہ ان کے اپنے خیالات پر یونانی فلاسفی کا خاصا اثر ہے جو اُن کے مذہبی نقطۂ نظر سے ظاہر ہوتا ہے۔ مثلاً الغزالی کی آیت النور کی تفسیر کو ہی لے لیں کہ وہ کس طرح یونانی فلاسفی کے عناصر کو اپنے خیالات کے ساتھ ملاتے ہیں اور اکثر و بیشتر وہ اس کا حوالہ بھی نہیں دیتے۔ زیر بحث عالمانہ خطبہ ان کی کتاب ''مشکوٰۃ الانوار'' میں ہے۔ یہ کتاب عربی سے انگریزی میں ولیم گیرڈنر نے The Niche of Lights کے نام سے ترجمہ کی ہے جو ۱۹۲۴ء میں پہلی مرتبہ لندن

سے شائع ہوئی۔

اس کے مطابق الغزالی نور کے فہم کے اعتبار سے انسانوں کی تین قسمیں بیان کرتے ہیں:

(۱) ''نور'' عوام کی سمجھ کے مطابق۔

(۲) ''نور'' خواص کی سمجھ کے مطابق۔

(۳) ''نور'' اخص الخواص کی سمجھ کے مطابق۔

عوام جن میں کہ سمجھنے کی صلاحیت زیادہ نہیں ہوتی' وہ ظاہری چیزوں کے علاوہ ان کی باطنی حقیقت کو بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے لیے نور ایک مادی مظہر ہے جس میں چیزیں ظاہر نظر آتی ہیں' حالانکہ بینائی ایک موضوعی عمل ہے جو ہر شخص اور ماحول کے مطابق مختلف ہوتا ہے۔ ممکن ہے ایک شخص کو ایک چیز نظر آ رہی ہو اور دوسرے کو وہ نظر نہ آ رہی ہو۔ اس طرح ایک شخص دیکھ سکتا ہے اور دوسرا (نابینا) روشنی کی موجودگی میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ بصارتی ملکہ کے تحت تمام چیزیں تین درجوں میں آتی ہیں:

(۱) جو خود بخود (بالذات) نظر نہ آئیں۔ ان پر روشنی پڑے تو نظر آئیں' مثلاً پتھر۔

(۲) جو خود تو نظر آئیں' لیکن دوسری چیزوں کو روشن نہ کریں' مثلاً ستارے۔

(۳) جو خود بھی نظر آئیں اور دوسری چیزوں کو بھی روشن کریں' مثلاً سورج۔

ان تین درجوں میں سے صرف تیسرا درجہ ایسا ہے کہ ان اشیاء کو روشنی (نور) کہا جا سکتا ہے۔ روشنی کا یہ وہ تصور ہے جس سے عوام واقف ہیں۔ خواص کے نزدیک بصارت کا انحصار دو چیزوں پر ہے۔ روشنی اور دیکھنے کی حِس' بلکہ دیکھنے کی حس زیادہ اہم ہے' کیونکہ اس سے چیزوں کا ظہور بھی ہوتا ہے اور ادراک بھی۔ دوسری طرف روشنی بذات خود کسی چیز کا فہم حاصل نہیں کرتی۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بصارت آنکھ میں ہے اور ''روشنی'' (بصارت یا نور) حقیقت میں ظاہری یا مجسم روشنی سے مختلف ہے۔ روشنی کا یہ تصور خاص افراد کے نزدیک ہے۔ اخص الخواص کا نظریہ یہ ہے کہ اگرچہ آنکھ یا بصارتی حس کا مجسم روشنی سے زیادہ موزوں نام ''روح باصرہ'' (نور) ہونا چاہیے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آنکھ یا بصارت یا بصارتی حِس میں ایک نقص ہے۔ وہ یہ کہ یہ دوسروں کا تو مشاہدہ کر سکتی ہے مگر خود کو دیکھ نہیں سکتی۔ یہ بہت دور کی چیز نہیں دیکھ سکتی۔ نہ ہی یہ بہت چھوٹی چیز کو دیکھ سکتی ہے' اور نہ پردے کے پیچھے کی چیزوں کو اور نہ ہی چیزوں کے اندرونی حصے کو۔ کبھی یہ مکمل چیز کی بجائے اس کے چند حصوں کو دیکھ سکتی ہے اور کبھی حصوں کی بجائے مکمل چیز کو دیکھ سکتی ہے۔ یہ محدود چیزوں کو دیکھ سکتی ہے' لامحدود کو نہیں۔ بڑی چیز اسے چھوٹی نظر آتی ہے۔ جو دور ہے وہ نزدیک نظر آتی ہے۔ جو کھڑی ہے وہ حرکت کرتی نظر آتی ہے اور جو حرکت کرتی ہے وہ کھڑی نظر آتی ہے۔ تاہم ایک اور ''آنکھ'' ہے جو بغیر اِن نقائص کے دیکھ رہی ہے۔ وہ آنکھ فہم و فراست (عقل' روح' نفس الانسانی) ہے جو مکمل اور غلطیوں سے پاک ہے' کیونکہ یہ چیزوں کی حقیقت کو دیکھتی ہے۔ مثلاً آنکھ

ایک لڑکے کے قد اور کاٹھ کو دیکھتی ہے جبکہ فہم وفراست دیکھتی ہے کہ وہ متواتر بڑھ رہا ہے۔ تاہم فہم و فراست میں وہم وخیال کی وجہ سے دھندلکا ہوسکتا ہے ۔ القصہ مادی روشنی کی نسبت بصارت زیادہ ''روشنی'' کہلانے کی حق دار ہے' جبکہ فہم وفراست (بصیرت) اس سے بھی زیادہ مناسب ''روشنی'' (نور) کہلانے کی مستحق ہے۔

قرآن' فہم وفراست کا سورج

فہم وفراست سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے جبکہ اس کی سمجھ کی متعدد شکلیں ہیں۔ کچھ علم' فہم کے لیے ودیعت شدہ ہے' اس لیے فوراً ہی اس کا ادراک کرلیا جاتا ہے' جبکہ دوسرے کے لیے منطقی دلیل دینی پڑتی ہے۔ اوّل الذکر کی مثال یہ قضیہ ہے کہ کوئی شے ایک ہی وقت میں موجود اور غیر موجود نہیں ہوسکتی۔ الغزالی تحریر کرتے ہیں کہ ''ایسے قضایا اور مسائل کے حل کے لیے فلاسفروں کے کلام کا فہم قیاسی کلیات کے سہارے سمجھنا ہوگا جس کے لیے تحریک اور مواد فلسفیانہ کلام سے ملتا ہے۔ پس جب فلسفیانہ روشنی پھیلتی ہے تو آدمی وہ کچھ بالفعل دیکھتا ہے جو کہ پہلے پوشیدہ اور بالقوۃ دیکھا تھا''۔

اس طرح اگر ایک چیز جس نے فہم کی غلطی کو درست کر کے اسے صحیح کر دیا تو یہ اس سے اعلیٰ روشنی ہوگی۔ الغزالی کے مطابق ''وحی'' کا یہی کام ہے۔ الہامی کتب اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے سب سے اعلیٰ فلاسفی ہے۔ اور قرآن مجید جو آخری وحی ہے' اعلیٰ ترین فلاسفی ہے۔ قرآن مجید کی آیات سورج کی شعاعوں کی مانند ہیں جن کے ذریعے ادراک وفہم کا عمل جاری ہوتا اور جلا پاتا ہے۔ جس طرح سورج آنکھ کے لیے ہے اسی طرح قرآن فہم کے لیے ہے' لہٰذا قرآن مجید زیادہ اہل ہے کہ روشنی کہلائے۔ بفحوائے آیت قرآنیہ:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالنُّوْرِ الَّذِیْٓ اَنْزَلْنَا﴾ (التغابن:۸)

''پس ایمان لاؤ اللہ پر' اس کے رسولؐ پر اور اُس نور پر جو ہم نے نازل کیا''۔

اس طرح سورج دو ہیں۔ ایک طبعی سورج جس کا تعلق عالمِ محسوسات ومشاہدہ سے ہے۔ ''**عالم الحس والمشاهدة**'' جو ظاہری روشنی پھیلاتا ہے اور خارجی بصارت دیتا ہے۔ اور دوسرا سورج قرآن جس کا تعلق عالمِ آخرۃ سے ہے' یعنی ''**عالم ملكوت**'' جو باطنی روشنی پیدا کرتا ہے اور فہم وفراست (بصیرت) کو پیدا کرنے میں مدد ہوتا ہے۔

زمینی اور ملکوتی روشنی کا تدریجی نظام

طبعی بصارت کا ایک نقص یہ ہے کہ آنکھ جب دیکھتی ہے تو وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس کے برعکس فہم جب دیکھ رہا ہو تو وہ نہ صرف دوسروں کو بلکہ خود کو بھی دیکھتا ہے۔ اور جو چیز ان دو عملوں سے اوپر ہو' وہ دوسروں کو بھی روشن کرتی ہو تو وہ اس سے بھی اوپر درجہ رکھتی ہے' اور وہ ہے ''ماورائی نبویؐ روح'' (الروح

القدسی النبویؐ)۔روشن کرنے والا چراغ (سراج منیر) جو دوسروں پر نور پھیلاتا اور انہیں چمکاتا ہے۔ ''نبوی روح'' صرف نبیوں میں ہوتی ہے یا اولیاء اللہ میں۔اور اس سے انسانیت کو غیب کی تختیاں پڑھائی جاتی ہیں (لوائح الغیب)۔دوسری دنیا (آخرت) کے اصول (احکام الآخرۃ) زمینی وملکوتی میدان کے عارفانہ حقائق (معارف ملکوت السمٰوٰت والارض)۔اور دینی سائنس (المعارف الربانیۃ)۔اگر رسولوں کو چراغوں سے تشبیہہ دی جائے تب جو چیز چراغ کو روشن کرتی ہے اس کی جانب آگ سے اشارہ کرنا زیادہ لائق ہے۔اور یہ فرشتوں کی مانند ہے جو رسولوں کے پاس وحی لاتے ہیں اور انہیں روشن کرتے ہیں۔اس طرح تمام رسول زمینی چراغ کا کردار ادا کرتے ہیں جو ملکوتی چراغوں ملائکہ (فرشتوں) سے منور ہیں۔اس طرح ملائکہ سے نبی کے منور ہونے کو ''نور پر نور'' کہتے ہیں۔﴿نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ﴾ (النور۳۵)۔

زمینی چراغ (رسول) دراصل انوار علیا سے نور حاصل کرتے ہیں۔اور خود ملائکہ ایسے ملکوتی نظام میں ہیں کہ ان میں سے اعلیٰ ترین (جبرائیلؑ) ہمہ وقت لامحدود نور کے قرب میں رہتا ہے: ﴿وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت) ''ہم میں سے ہر ایک کی جگہ مقرر ہے اور ہم تو (بندگیٔ الٰہی میں) صف بستہ کھڑے ہیں''۔

اخص الخواص کا تصور

ملکوتی روشنیاں یا چراغ بے شمار ہیں۔ہر نیچے والا اوپر والے سے منور ہوا۔ان کا یہ نظام نتیجتاً بلند ترین درجے یعنی ''نورالانوار'' تک پہنچتا ہے' جو تمام روشنیاں پھیلاتا ہے اور اس کی روشنی اپنی ذاتی ہے۔ انتہائی روشنی (نور) اللہ تعالیٰ کی ہے۔پس الغزالی لکھتے ہیں کہ جس طرح ہر چیز روشنی کی وجہ سے آدمی کی نظر میں آتی ہے اسی طرح ہر چیز اللہ تعالیٰ کی وجہ سے آدمی کی باطنی نگاہ میں آتی ہے' کیونکہ وہ (اللہ تعالیٰ) ہر وقت ہر چیز کے ساتھ ہے اور اسی وجہ سے ہر چیز ظاہر ہوتی ہے۔اس طرح آیت النور کے پہلے جزء ''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے'' (النور۳۵) کی تشریح کی جاسکتی ہے۔یہ ہے روشنی کا وہ تصور جو اخص الخواص نے سمجھا ہے' جس میں رسول اور اولیاء شامل ہیں۔

غزالیؒ کے متذکرہ بالا خیالات کو جمع کریں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔یعنی اللہ تعالیٰ دُنیوی اور ملکوتی چراغوں کی روشنی ہے۔مندرجہ بالا توضیح سے پوری طرح یہ واضح نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ بطور نور اور مخلوق میں کس طرح کا رشتہ ہے؟ یا کیا تعلق ہے؟ الغزالی لکھتے ہیں کہ روشنی کا مطلب ہے ''ظاہر ہونا یا نمایاں ہونا'' اس لیے جو دوسروں پر ظاہر نہ ہو وہ اندھیرا ہے۔اگرچہ وہ موجود ہے لیکن اس کی موجودگی دوسروں پر ظاہر نہیں ہے۔اس کا مطلب ہے کہ مطلق ظلمت نیستی ہے' کیونکہ نیستی نہ دوسروں پر ظاہر ہے اور نہ بذات خود موجود ہے۔پس اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر نیستی ظلمت ہے تو ہستی (وجود)

روشنی ہے۔

ہستی دو قسم کی ہے۔ ایک وہ جس کا وجود ذاتی ہو۔ ثانیاً جس کا وجود غیر سے مستعار ہو۔ یہ دوسری قسم دراصل حقیقی وجود نہیں رکھتی۔ حقیقی ہستی صرف وہ ہے جو بذات خود ہو بغیر کسی کی مدد کے۔ ایسی ہستی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ پر منحصر ہے۔ اس طرح الغزالی سمجھاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور یہ اس کے مترادف ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کی اصل وجودی حقیقت ہے۔

الغزالی اچھی طرح جانتے تھے کہ اس تشریح پر ''ہمہ اوست'' کا اعتراض ہوسکتا ہے' کیونکہ الغزالی کی توضیح کا مطلب ہے سب کچھ اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر پوچھا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اس کی مخلوق سے کیا تعلق ہے؟ علاوہ ازیں الغزالی کے بیان کے مطابق کہ ''وہ ہر لحہ ہر چیز کے ساتھ ہے اور ہر چیز اسی کے ساتھ ظاہر ہوتی ہے'' اس سے کوئی کیا سمجھے گا؟ الغزالی اس کا جواب دو تمثیلوں کی مدد سے دیتے ہیں۔ اوّلاً وہ فرماتے ہیں کہ جب ہم سورج کی روشنی میں چیزیں دیکھتے ہیں تو ہم سورج کی روشنی نہیں دیکھتے بلکہ چیزیں اور سورج دیکھتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو جب دیکھتے ہیں تو صرف مخلوق کو دیکھتے ہیں نہ کہ اللہ کے وجود کا اثر مخلوق پر۔ دوسری مثال الغزالی یہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم کوئی مظہر مثلاً رنگ دیکھتے ہیں تو صرف رنگ دیکھتے ہیں' اس کے گرد کچھ اور چیز نہیں' حالانکہ رنگ بغیر روشنی کے کچھ نہیں ہے' کیونکہ یہ صرف روشنی ہے جس سے ہم رنگ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ عمل روزمرہ زندگی میں ہوتا ہے کہ ہم رنگ دیکھتے ہیں' روشنی نہیں۔ یہ غالباً روشنی کی ازبس ظاہریت اور رنگ کے ساتھ شدت سے ملنے کی وجہ سے ہے۔ اس سے زیادہ روشنی شاید اپنی شدت کی وجہ سے نظر نہیں آتی' کیونکہ چیزیں جو ایک حد پر پہنچ جاتی ہیں وہ دوسری طرف کی حد پر چلی جاتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ چیزیں جو ظہور کی آخری حد پر ہوتی ہیں نہ دکھائی دینے والی (مخفی) بن جاتی ہیں۔ عربی کا مقولہ ہے کہ **تُعرفُ الاشیاءُ باضدادھا** یعنی چیزیں اچھی طرح اس وقت سمجھی جا سکتی ہیں جب ان کا مقابلہ ان کی مخالف چیزوں سے ہو۔ لہٰذا وہ چیز جس کا نہ کچھ مخالف ہو نہ مقابل' وہ ہمیشہ ایک جیسی نظر آنے والی ہو' تو جب آپ اس کو دیکھتے ہیں تو ممکن ہے کہ وہ آپ کے ذہن پر اثر انداز ہونے سے رہ جائے' یعنی آپ کے نوٹس میں نہ آئے۔ اندریں صورت اس کا نامعلوم یا ناقابل مشاہدہ ہونا اس کے از حد عیاں ہونے کا نتیجہ ہے اور اس کی انتہائی تابناکی نگاہوں سے پوشیدگی کا باعث بنتی ہے۔

آیۃ النور کی رمزیت اور انسانی روح کے پانچ قویٰ

اب ہم آیۃ النور میں بیان کیے گئے چھ تمثیلی الفاظ کا الغزالی کی تفسیر میں ذکر کریں گے۔ طاق' چراغ'

لیمپ کے گرد شیشے کا گھیرا یا چمنی' ستارہ' درخت (زیتون)' تیل (زیت)۔ الغزالی ان کو روح کے قویٰ سے تعبیر کرتے ہیں۔ روحانی حسوں یا قویٰ کے نظام کا اصول سب سے پہلے یونانی فلاسفی میں ارسطو (۳۸۴۔۳۴۴ ق م) نے بیان کیا' جسے فارابی (۸۷۰۔۹۵۰م) اور ابن سینا (۹۸۰۔۱۰۳۷م) نے اسلامی لبادہ پہنایا۔ مؤخر الذکر دو مفکرین کے خیالات الغزالی کے فکر کا ماخذ ہیں اور انہوں نے بہت سے افکار ان سے مستعار لیے ہیں۔

مشکوٰۃ روح الحساس: یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے حسّی معلومات کی آمد ہوتی ہے۔ یہ جسمانی آنکھ' زبان' ناک' کان وغیرہ سے مواد وصول کر کے روح الحساس کو دیتی ہے جو حیوانی جان کی جڑ اور اصل ہے۔ یہی انسان میں بھی فطری طور پر موجود ہے۔

زجاجہ روح الخیالی: یہ وہ قوت ہے جس کے ذریعے معلومات کو جمع کرنے اور دوبارہ یادداشت کے لیے ڈیٹا روح الحساس کو پہنچایا جاتا ہے۔ یہ ڈیٹا کے ضائع ہونے سے حفاظت کرتا ہے اور استعمال کے لیے بالائی سطح کے قویٰ کو پیش کرتا ہے۔ یہ انسان میں فطرتاً موجود نہیں ہے' مگر وقت اور تجربات کے ساتھ پیدا ہوتا اور بڑھتا رہتا ہے۔

زیت روح العقلی: یہ وہ قوت ہے جو زیادہ تر ذہنی یا تجریدی سطح پر کام کرتی ہے' کیونکہ یہ تصور اور سمجھ کی سطح سے اوپر اٹھتی ہے۔ اس کے کام کا میدان زیادہ تر اولیات اور بدیہیات (سچائی وغیرہ) ہے' مثلاً کوئی شے بروقت موجود اور غیر موجود نہیں ہو سکتی۔ یہ صلاحیت انسانوں کے لیے ہی خاص ہے مگر اکتسابی ہے۔ اسے تیل سے تشبیہہ دے سکتے ہیں' کیونکہ یہ دوسری اعلیٰ تر حسوں کے لیے ایندھن کا کام دیتی ہے۔

شجرہ (زیتون کا درخت) روح الفکری: یہ حاسہ منطقی دلائل سے بحث کرتا ہے۔ اس کا مقصد مختلف قضایا یا مسلّمات کو دیکھنا اور ان سے ان کے نتائج برآمد کرنا ہے۔ برآمد شدہ نتائج خود بخود اگلے غور و فکر کے لیے مواد بن جاتے ہیں۔ اس فکری جانچ پرکھ کے قضایا کا ملانا اور نتائج کا نکالنا ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ اس کا مناسب ترین نشان درخت کا ہے جس کی شاخیں سب طرف پھیل جاتی ہیں جس طرح منطقی دلائل اور ان کے تضمنات۔ اس آیت میں زیتون کے تیل کی مثال دی گئی ہے' کیونکہ اس آیت میں دراصل اس کے تیل کا ذکر ہے جو روشنی کو شدید کرتا ہے' اسی لیے اسے برکت والا درخت کہا گیا ہے۔ یہ تیل چراغوں کو روشن کرتا ہے۔ جس طرح مختلف مسائل کی شاخیں' پھر وہ نتائج بنتی ہیں' اور نتائج عقلی ہونے کی نسبت سے ایک ٹھوس چیز بن جاتے ہیں جو نہ اِدھر ہوتے ہیں نہ اُدھر۔ اسی لیے یہ درخت نہ مشرق کی طرف کا نہ مغرب کی طرف کا ﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ کہلاتا ہے۔

ماورائی روح النبویؐ (الروح القدسی النبویؐ) کے متعلق امام الغزالی کا نظریہ اب بیان کیا جا سکتا

ہے۔ یہ روح انبیاء اور اولیاء میں موجود ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کچھ علوم انسان میں فطرتاً موجود ہوتے ہیں' جبکہ دوسری قسمیں اکتساب اور نشوونما چاہتی ہیں۔ اس نشوونما کے عمل کا کچھ حصہ ذاتی ترقی کا آئینہ دار ہے' جبکہ بقیہ خارج سے ملتا ہے۔ یہ دوسری قسم کا حصہ کچھ لوگوں کے لیے ایسی اونچی سطح پر پہنچ جاتا ہے کہ اولیاء کی روشنی تقریباً اس سے بے نیاز ہو جاتی ہے جو انہیں پیغمبر عطا کرتے ہیں اور پیغمبروں کے لیے وہ روشنی فرشتوں کی عطا سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ لہٰذا آیت کے الفاظ کی اس صورت حال کی ترجمانی انتہائی موزوں ہے کہ جس کے تیل کا بھڑکیلا پن روشنی کے اتنا نزدیک ہوتا ہے حالانکہ ابھی آگ نے اسے چھوا بھی نہیں ہوتا۔

﴿ نُوْرٌ عَلٰی نُوْرٍ ﴾ ''روشنی پر روشنی'' کے جملہ کی ایک توضیح اس طرح سمجھ آتی ہے کہ وحی الٰہی کی روشنی کا فرشتوں کی روشنی کے منبع سے گزر کر پیغمبر کی روح پر نزول ہونا۔ اب یہ سمجھنا چاہیے کہ روشنیوں کی شعائیں انسانی روح پر روشنی کی پہلی حسی روشنی سے لے کر نبوی روح کی روشنی تک ایک تدریجی تسلسل کا نزول ہیں۔ ان الفاظ کا صحیح مفہوم اسی طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔

ظلمت اور اس کے درجات کا بیان

مشکوٰۃ الانوار میں الغزالی چالیسویں آیت کی تشریح کرتے ہیں۔ اس آیت کے مطابق الغزالی کا خیال ہے کہ روشنی ہدایت کا ایک نشان ہے' جبکہ اندھیرا گمراہی کا نشان ہے۔ جس طرح ایک آدمی ہدایت کی روشنی کے مختلف درجات سے ہدایت حاصل کرتا ہے' اسی طرح وہ گمراہیوں کی ظلمت کی تہوں تلے ڈھانپا ہوا ہوتا ہے۔ آیت اس حقیقت کو اس طرح بیان کرتی ہے: ''کسی اتھاہ گہرے سمندر میں' جہاں موج پر موج چھائی ہوئی ہو' اس پر گہرے بادل چھائے ہوں' اندھیرے پر اندھیرے' گہرے اندھیرے''۔ الغزالی اتھاہ گہرے سمندر کو اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے یہ دنیا جس میں مہلک خطرات' شیطانی حوادث اور اندھا کرنے والی تکالیف ہیں۔ اس اتھاہ گہرے سمندر میں پہلی موج کو شہوت کہتے ہیں جو تمام سفلی جذبات کی جڑ ہے۔ دوسری موج غیر اخلاقی خاصیتیں ہیں' مثلاً غصہ' نفرت' بغض' تکبر' اور بھڑک اٹھنا وغیرہ۔ اس پر بادل' منفی عقلی رویئے ظاہر کرتے ہیں' مثلاً خبیث اور فاسد خیالات۔ جیسا کہ بادل کا کام روشنی کو روکنا ہے یہ ''ذہنی بادل'' چمکتی ہوئی روشنیوں کو روک دیتے ہیں' قرآن مجید اور پیغمبر کی ہدایت کو بھی' خواہ وہ کتنی ہی قریب ہوں۔ یہ آیت ایسے گمراہ لوگوں کو یوں ظاہر کرتی ہے: ''اگر ایک آدمی ایسے میں اپنا ہاتھ بڑھائے تو وہ اسے نہ دیکھ سکے''۔ آخری تجزیے میں یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ وہ روشن کرے ایمان کے ساتھ جس کے دل کو چاہے' کیونکہ جسے اللہ روشنی نہ دے اس کے لیے کوئی روشنی نہیں ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کی توضیح

ڈاکٹر اسرار احمد ۱۹۳۲ء میں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری سے متأثر تھے۔ بعد میں ان کی فلاسفی کے بھی قائل ہوئے۔ اقبال کی فلاسفی نے قدرے جدید یورپی فلاسفی سے جوش و ولولہ حاصل کیا' اسی لیے شعوری طور پر انہوں نے یونانی فلسفے کو ردّ کیا جسے قدیم مسلمانوں نے اختیار کر لیا تھا۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے خیالات پر دوسری چھاپ جنوبی ایشیا کے دیوبندی مدرسہ کی تھی۔ اس مدرسہ کے مطابق صوفیانہ سلسلہ قائم رکھتے ہوئے اس کی وحدت الوجود کی توضیح ''ہمہ اوست'' پر اعتراض کیا جاتا تھا' جس وجہ سے ڈاکٹر صاحب پر یونانی فلسفہ اثر انداز نہ ہو سکا۔ یہی وجہ ہے کہ الغزالی کی آیت النور کی تفسیر ''ہمہ اوست'' کے تحت ڈاکٹر صاحب نے قبول نہیں کی بلکہ اس کے برعکس روشنی کو مخلوق اور وجودی کہا جو اللہ تعالیٰ سے مختلف چیز ہے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب کو ان کے سائنسی اور میڈیکل سائنس کے پس منظر کی نسبت سے جدید فزیکل سائنسز کی مبادیات اور منہاج کو سمجھنے میں مدد ملی اور انہیں مذہب کی تفہیم میں ان کی افادیت کو سمجھنے کا موقع ملا۔ اب ہم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی پیش کردہ آیۃ النور کی تفسیر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

روشنی کی ماہیت

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب برخلاف امام غزالیؒ کے روشنی کو مادی حقیقت یا زمانی مظہر تصور کرتے ہیں' لہٰذا یہ اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے ان کے اپنے دلائل ہیں۔ آیاتِ قرآنیہ کے الفاظ کی تحلیل کی جائے تو ''نُورِہٖ'' کا مطلب ہے اُس (اللہ تعالیٰ) کا نور یا اُس (اللہ تعالیٰ) کی روشنی۔ چنانچہ اس میں اضافیت کا مفہوم ہے۔ گویا اس طرح کہا جائے ''میرا قلم''۔ یقیناً ''میرا قلم'' ''میری ذات اور میرے تشخص'' سے مختلف ہے' اگرچہ ان دونوں کی نسبت مجھ سے ہے۔ اس لیے نُورِہٖ کو اس اضافی ملکیتی اثر کے تحت سمجھنا چاہیے۔ حتمی دلیل کے طور پر ڈاکٹر اسرار ایک اور مثال دیتے ہیں: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَالنُّوْرَ﴾ ''تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کیے اور اندھیرا اور اجالا بنایا۔'' (الانعام:۱)

یہ بلاشبہ ظاہر کرتا ہے کہ ''روشنی یا نور'' جو مخلوق ہے خالق کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب روشنی کو ایسی مادی چیز خیال کرتے ہیں جس سے ہمارے اردگرد کا ماحول روشن ہوتا ہے اور ہم اس میں چیزیں دیکھ سکتے ہیں' یعنی اس کا تعلق ہماری ''خارجی بصارت'' سے ہے۔ اسی طرح ہماری اندرونی روشنی جسے ہم ''بصیرت'' کہتے ہیں' کی ہمیں ضرورت ہوتی ہے جس سے ہم اپنی اندرونی اشیاء یعنی مظاہر کے پس پردہ ''پوشیدہ حقائق'' کو دیکھتے ہیں۔ یہ وہ پوشیدہ حقیقت ہے جس کا حضور ﷺ نے اپنی دعا میں اشارہ کیا ہے۔

''اے اللہ مجھے چیزوں کی اس حقیقت سے آگاہ فرما جس طرح کہ وہ ہیں''۔ یہ باطنی روشنی دراصل اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے۔ یا دوسرے معنوں میں ایمان جیسا کہ درج ذیل آیت سے ظاہر ہے: ﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ﴾ (البقرۃ:۲۵۷) ''اللہ ان کا دوست ہے جو ایمان رکھتے ہیں، وہ انہیں ظلمت کی گہرائیوں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے''۔ پس وہ لوگ جو ایمان کی داخلی روشنی رکھتے ہیں کُل حقیقت ان پر عیاں ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق ایمان کا موضوع اور فلسفہ کا موضوع اپنی جامعیت میں ایک ہی ہے۔ صاحب ایمان ہونے کا مطلب ہے: اشیاء کی حقیقت جاننا جس طرح وہ فی الحقیقت ہیں۔

ایمان کے لیے ایک مفصل مثال

آیت نور پر ڈاکٹر صاحب اپنی تفسیری رائے کی بنیاد حضرت اُبی بن کعبؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اقوال پر رکھتے ہیں۔ حضرت اُبی بن کعبؓ کی روایت کے مطابق الفاظِ قرآنی ''مَثَلُ نُوْرِهٖ'' (مثال اس کے نور کی) سے مراد مَثَلُ نُوْرِ مَنْ اٰمَنَ (مثال اس کی روشنی/نور کی جو ایمان لایا ہے) جبکہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی رائے میں ان الفاظ قرآنیہ کا مفہوم یا مدلول مَثَلُ نُوْرِهٖ فِيْ قَلْبِ الْمُؤْمِنِ (اس کے نور کی مثال قلب مؤمن میں) ہے۔ ان دونوں آراء سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ ایمان کا مسکن قلب ہے، بفحوائے آیات قرآنیہ: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۷) ''لیکن اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لیے پسندیدہ بنا دیا ہے اور تمہارے دلوں میں مزین کر دیا ہے'' اور: ﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ (الحجرات:۱۴) ''اور ابھی ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔

جسمانی مثال

ڈاکٹر صاحب آیۃ النور کی روشنی کی مثال مؤمن کے دل میں ایمان سے دیتے ہیں۔ وہ اس آیت کی وسیع تر موافقت میں انسانی جسمانی ساخت کو بطورِ مثال پیش کرتے ہیں۔ اس پہلو سے طاق کی مثال ان پسلیوں سے دی جاتی ہے جو دل کو گھیرے ہوئے ہیں۔ ایک دفعہ اگر دل ایمان کی روشنی سے منور ہو جائے تو یہ چمکدار لیمپ کی طرح چمکتا ہے۔ زجاج (چمنی) کا مقصد شعلے کو ہوا سے بچانا ہے تاکہ لیمپ کی روشنی سب طرف ایک جیسی منعکس ہو اور یکساں اعتبار سے ماحول کو منور کرے۔ اب ''دل'' کا لفظ خالص جسمانی ساخت کے لیے سمجھ لیں یا روحانی اصطلاح میں۔ پہلی اصطلاح میں دل ایک عضلاتی پمپ ہے جو چھاتی کے گھیرے میں موجود ہے۔ پسلیاں اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ دوسری اصطلاح کے مطابق دل فہم و فراست اور معرفت کی ایک قوت ہے جس سے چیزوں کی حقیقت اس طرح معلوم ہوتی ہے جیسے کہ وہ ہیں۔ انسانی روح میں یہ ایک نہایت اہم قوت ہے جو حقیقی دانشمندی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال

کے مطابق یہ دونوں انداز یعنی جسمانی اور روحانی ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے بلکہ ایک دوسرے کا تکملہ ہیں۔ نتیجتاً انہوں نے ''طاق میں چراغ'' کو ''پسلیوں کے پنجرہ میں دل'' کی عمدہ مثال سے واضح کیا۔ لیکن پھر وہ اس چراغ کی روشنی اور اس میں جلنے والے تیل کو مذہبی اور روحانی الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کے خیال کے مطابق قلب روحانی' جسمانی دل نہیں ہے۔ پھر بھی دونوں ایک دوسرے سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔ یہ منہج فکر روحانی اور مادی دونوں صورتوں کو نہ صرف اہمیت دیتا ہے بلکہ انہیں ایک وحدت میں پروتا ہے۔

قرآن مجید میں بیان کردہ زیتون کے درخت کے بارے میں عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ یہ میدان میں اکیلا ہے یا کسی پہاڑی کی چوٹی پر۔ ایسا اکیلا درخت سورج کی روشنی یا حرارت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتا ہے۔ ﴿لَا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ﴾ یعنی ''نہ شرقی نہ غربی'' کا یہی مطلب ہے۔ ایسے درخت کا تیل نہایت خالص ہوتا ہے جو بھڑک اٹھنے اور روشن ہونے کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ ہمارے زمانہ میں ڈاکٹر صاحب کے تصور کا مصداق گیسولین ہوگا جو پٹرولیم سے بنتا ہے اور نہایت بھڑکیلا اور بخارات بن کر اڑنے والا ہے۔ چونکہ گیسولین بہت جلد آگ پکڑ لیتا ہے اس لیے ایسے معلوم ہوتا ہے کہ بھڑکنے کے لیے بے تاب ہے۔ خالص' صاف ستھرے زیتون کی بھی یہی خاصیت ہے جو قرآن مجید نے بیان کی ہے کہ بھڑک اٹھنے کے لیے ہمہ وقت تیار ہے پیشتر اس کے کہ آگ اس کو چھوئے۔ قرآن کریم نے ایمان کی وضاحت جو لیمپ میں جلنے والے زیتون کے تیل سے کی ہے' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایمان کے دو حصے ہیں۔ تیل میں جلنے کی صلاحیت ہے' لیکن اس کو جلانے کے لیے بیرونی عنصر آگ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایمان کی روشنی اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب فطرت کی روشنی اور وحی کی روشنی دونوں باہم مل جاتی ہیں۔

دوہری مثال: روشنی پر روشنی (نورٌ علیٰ نورٍ)

زیتون کا تیل راست' اصلی وقدیمی اور غیر مسخ شدہ' انسانی فطرت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو لوگ اپنی خلقی فطرت کو فضول خواہشات' لذات اور جاہلانہ رسومات سے محفوظ رکھتے ہیں وہ فوراً اور دل کی گہرائی سے وحی الٰہی کو قبول کرنے کی فطری پوزیشن میں ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ وحی کی پکار اور وحی کی حقیقت پر' جو ان کے اندر پہلے سے موجود ہوتی ہے' ذرا نہیں جھجکتے۔ ان کی اندرونی فطری روشنی اور بیرونی وحی کی روشنی مل کر آیت النور کے مطابق نورٌ علیٰ نورٍ (روشنی پر روشنی) بن جاتی ہے۔ اس کا اظہار اس دعا میں بھی ہے کہ جب بندۂ مؤمن پکارے گا' جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا﴾ (آل عمران: ۱۹۳) ''اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ہمیں دعوت دے رہا تھا کہ اپنے رب پر ایمان لاؤ' پس ہم ایمان لے آئے.....''

کفر کی مثال بصورت ظلمت (اندھیرا)

سورۃ النور کی آیت ۳۹ و ۴۰ میں کفر کا بیان ہے جو ایمان کی ضد ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں کہ جس طرح ایمان کی دو صورتیں ہیں' ایک ظاہری (زبانی اقرار) اور دوسری باطنی (قلبی یقین) اسی طرح کفر کی بھی دو صورتیں ہیں' یعنی اس میں بھی ایک ظاہری حالت (قانونی کفر) ہے اور دوسری باطنی حالت (حقیقی کفر)۔ اسلام کا زبانی اقرار (اقرارٌ باللسان) ایک ظاہری اور قانونی حالت ہے' کیونکہ اقرار کرنے والا مسلم قوم کا ممبر بن جاتا ہے۔ اسی طرح ایمانی حقائق کا زبانی انکار کرنے والا قانونی طور پر مسلم قوم سے الگ آدمی ہے۔ اس کے برعکس ایمان کا قلبی یقین یا انکار قانونی حالت نہیں ہے بلکہ وہ ایسی تجرباتی حقیقت ہے جو کسی کے دل کی سیماب وش کیفیت کا مظہر ہے۔ جبکہ قانونی درجہ میں ایمان اور کفر دونوں کا ''ہے یا نہیں'' کے اعتبار سے فیصلہ کیا جائے گا (یعنی کوئی یا تو مسلم ہے یا کافر) لیکن دل کے معاملہ میں ایمان یا کفر صرف ''بڑھنے یا گھٹنے'' (کم یا زیادہ) کی حالت میں ہو سکتے ہیں۔

سورۃ النور کی آیت ۳۹ اور ۴۰ میں قلبی کفر کی بات ہے جو ظاہری اور قانونی اسلام کے ساتھ موجود ہو سکتا ہے۔ ہمیں ان مثالوں کو سنجیدگی سے سمجھنا چاہیے' کیونکہ یہ مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہو سکتی ہیں۔

کفر کس طرح ''اعمالِ صالحہ'' کو مٹاتا ہے

آیت ۳۹ کی مثال ان لوگوں پر صادق آتی ہے جو سچائی یعنی ایمانی حقائق کو تسلیم نہیں کرتے اور انکار کا رویہ اختیار کرتے ہیں' لیکن بزعمِ خویش ''نیکیوں'' کا ڈھیر جمع کرتے ہیں۔ مثلاً انہوں نے یتیم خانے' مدرسے' ہسپتال بنائے ہیں یا دوسرے خیراتی کاموں کے لیے رقمیں مختص کی ہیں۔ چونکہ وہ کام اللہ کے لیے نہیں کیے گئے بلکہ کسی اور مقصد کے تحت کیے گئے' لہٰذا یہ سب ''اعمالِ صالحہ'' قیامت کے دن راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے اور ان کا میزانِ خداوندی میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ کے نزدیک نیک اعمال کا شمار باطنی حقیقت کے مطابق ہے نہ کہ مزعومہ خواہشات یا ظاہری شکل کے مطابق۔ قرآن مجید میں یہ سچائی اس طرح بیان کی گئی ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰـكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

''نیکی یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر دو' بلکہ اصل نیکی اس کی ہے جو

ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور انبیاء پر۔ اور دیا اس نے مال اس کی محبت کے علی الرغم رشتے داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافر کو اور سائلوں کو اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور قائم کی اس نے نماز اور ادا کی زکوٰۃ۔ اور پورا کرنے والے اپنے عہد کے جبکہ کوئی باہم معاہدہ کرلیں۔ اور بالخصوص صبر کرنے والے فقر و فاقہ میں' تکالیف و مصائب پر اور جنگ کے وقت۔ یہی ہیں وہ لوگ کہ جو واقعتاً راست باز ہیں' اور یہی ہیں وہ لوگ جو حقیقتاً متقی ہیں۔''

یہاں سراب کی مثال بہت ہی عمدہ اور مناسب ہے۔ گویا ایک بدقسمت آدمی ان اعمال پر انحصار کرتا ہے جو اس نے ایمان اور صحیح نیت کے بغیر کیے۔

مکمل کفر کی مثال

آیت نمبر ۴۰ کی تمثیل کا تعلق ان سے ہے جو نہ صرف سچائی کو ماننے سے انکار کرتے ہیں' بلکہ اخلاقی بصیرت سے بھی محروم ہیں کہ اچھے اور برے اعمال میں فرق نہیں کر سکتے۔ بالکل مسخ شدہ یا نہایت کمزور بنیادی فطرت اور اخلاقی حس سے تہی دامن لوگ جو اپنی ہی خواہشات کے غلام بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صحیح ترین مثال یہ ہے کہ وہ ''اندھیروں کی موجوں کے نیچے ہیں جو تہہ بہ تہہ ایک دوسرے پر ہیں''۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ کسی کی فطری باطنی روشنی اور بیرونی وحی کی روشنی مل کر ایمان کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور یہی ایمان پھر ان کو چیزوں کی اصل حقیقت' جس طرح کہ وہ ہیں' دکھاتا ہے۔ جو داخلی فطری روشنی سے محروم ہیں وہ وحی کی روشنی سے بھی کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے خواہ وہ انہیں میسر ہو ہی جائے۔ وہ ہمیشہ کے لیے اندھیروں میں بھٹکتے اور اپنے کفر کی پاداش میں حقیقت سے ابدی طور پر محجوب رہتے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ﴿وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَـهٗ نُوْرًا فَمَالَـهٗ مِنْ نُّوْرٍ﴾ ''جس کو اللہ تعالیٰ نورِ (ہدایت) نہ دے وہ (ایمان کی) روشنی نہیں پا سکتا''۔ oo

اربابِ قلم متوجہ ہوں

وہ احباب جو قلم و قرطاس کے ذریعے دینِ مبین کی خدمت میں مصروفِ کار ہیں' ان سے گزارش ہے کہ وہ قرآنی معارف اور دیگر علمی و فکری موضوعات پر اپنی نگارشات سہ ماہی ''حکمت قرآن'' میں اشاعت کے لیے ارسال فرمائیں' تاکہ قرآنی حکمت و بصیرت کو عام کیا جا سکے اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کی راہ ہموار ہو سکے۔

تحریریں اس پتے پر بھیجیں:

مدیر منتظم سہ ماہی ''حکمت قرآن''، شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی K-36' ماڈل ٹاؤن لاہور

فون: 3-5869501' ای میل: irts@tanzeem.org

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۷۷، ۷۸

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَشۡتَرُوۡنَ بِعَهۡدِ اللّٰهِ وَاَیۡمَانِهِمۡ ثَمَنًا قَلِیۡلاً اُولٰٓئِکَ لاَ خَلاَقَ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ وَلاَ یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلاَ یَنۡظُرُ اِلَیۡهِمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَلاَ یُزَکِّیۡهِمۡ وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۞ وَاِنَّ مِنۡهُمۡ لَفَرِیۡقًا یَّلۡوٗنَ اَلۡسِنَتَهُمۡ بِالۡکِتٰبِ لِتَحۡسَبُوۡهُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الۡکِتٰبِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ ۚ وَیَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ وَهُمۡ یَعۡلَمُوۡنَ ۞﴾

ل و ی

لَوٰی (ض) لَیًّا: بنیادی مفہوم ہے رسّی بٹنا' پھر زیادہ تر دو معانی میں آتا ہے: (۱) کسی چیز کو مروڑنا۔ (۲) کسی چیز کو گھمانا۔ ﴿وَاِنۡ تَلۡوٗۤا اَوۡ تُعۡرِضُوۡا﴾ (النساء:۱۳۵) ''اور اگر تم لوگ مروڑتے ہو (بات کو) یا اعراض کرتے ہو۔'' ﴿اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ﴾ (آل عمران:۱۵۳) ''جب تم لوگ بھاگے جاتے تھے اور نہیں گھماتے تھے (گردن کو) کسی ایک پر۔''

لَوّٰی (تفعیل) تَلۡوِیَةً: بار بار مروڑنا' بار بار گھمانا۔ ﴿لَوَّوۡا رُءُوۡسَهُمۡ﴾ (المنٰفقون:۵) ''تو وہ لوگ مٹکاتے ہیں اپنے سروں کو۔''

ل س ن

لَسِنَ (س) لَسَنًا: قوتِ گویائی والا ہونا۔

لِسَانٌ ج اَلْسِنَةٌ: اسم ذات ہے اور دو معانی میں آتا ہے: زبان بمعنی بولی۔ (۲) زبان بمعنی عضوِ گویائی۔ ﴿لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ● بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○﴾ (الشُّعراء) ''تاکہ آپؐ ہو جائیں خبردار کرنے والوں میں سے۔ واضح عربی زبان میں۔'' ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ﴾ (القیٰمة:۱۶) ''آپؐ بار بار حرکت نہ دیں اس کے ساتھ اپنی زبان کو۔''

ترکیب: ''اَیْمَانِهِمْ'' میں ''اَیْمَانِ'' کی جر بتا رہی ہے کہ یہ ''بِ'' پر عطف ہے۔ ''اَلَّذِیْنَ'' کا موصول ''اُولٰٓئِکَ'' ہے۔ ''یَوْمَ'' ظرف ہے۔ ''فَرِیْقًا'' نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''یَلْوٗنَ'' دراصل باب ضَرَبَ سے فعل مضارع ''یَلْوِیُوْنَ'' تھا جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر ''یَلْوُوْنَ'' ہوا' جسے ''یَلْوٗنَ'' لکھا گیا ہے۔

ترجمہ:

اِنَّ الَّذِیْنَ : بے شک جو لوگ	یَشْتَرُوْنَ : خریدتے ہیں
بِعَهْدِ اللّٰهِ : اللہ کے عہد کے بدلے	وَاَیْمَانِهِمْ : اور اپنی قسموں کے بدلے
ثَمَنًا قَلِیْلًا : تھوڑی قیمت کو	اُولٰٓئِکَ : یہ وہ لوگ ہیں
لَا خَلَاقَ : بھلائی میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں ہے	لَهُمْ : جن کے لیے
فِی الْاٰخِرَةِ : آخرت میں	وَلَا یُکَلِّمُهُمُ : اور کلام نہیں کرے گا ان سے
اللّٰهُ : اللہ	وَلَا یَنْظُرُ : اور نہ ہی وہ دیکھے گا
اِلَیْهِمْ : ان کی طرف	یَوْمَ الْقِیٰمَةِ : قیامت کے دن
وَلَا یُزَکِّیْهِمْ : اور نہ ہی وہ پاک کرے گا ان کو	وَلَهُمْ : اور ان کے لیے
عَذَابٌ اَلِیْمٌ : ایک دردناک عذاب ہے	وَاِنَّ : اور بے شک
مِنْهُمْ : ان میں	لَفَرِیْقًا : لازماً ایک ایسا فریق ہے
یَّلْوٗنَ : جو مروڑتا ہے	اَلْسِنَتَهُمْ : اپنی زبانوں کو
بِالْکِتٰبِ : کتاب میں	لِتَحْسَبُوْهُ : تاکہ تم لوگ گمان کرو اس کو
مِنَ الْکِتٰبِ : کتاب میں سے	وَمَا هُوَ : حالانکہ وہ نہیں ہے
مِنَ الْکِتٰبِ : کتاب سے	وَیَقُوْلُوْنَ : اور وہ لوگ کہتے ہیں
هُوَ : وہ	مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ : اللہ کے پاس سے ہے
وَمَا هُوَ : حالانکہ وہ نہیں ہے	مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ : اللہ کے پاس سے

وَيَقُوْلُوْنَ :اوروہ لوگ کہتے ہیں	عَلَى اللّٰهِ :اللہ پر
الْكَذِبَ :جھوٹ	وَ:اس حال میں کہ
هُمْ :وہ لوگ	يَعْلَمُوْنَ: جانتے ہیں

نوٹ : کسی سے بات نہ کرنا اور اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا دراصل غصے اور ناراضگی کی انتہائی اور آخری شکل ہے۔اس سے معلوم ہو گیا کہ آخرت میں ایک طرف تو کچھ وہ نصیبے والے ہوں گے جو کسی حساب کتاب کے بغیر جنت میں جائیں گے' وہیں کچھ ایسے بدنصیب بھی ہوں گے جو کسی حساب کتاب کے بغیر جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔

آیات زیر مطالعہ میں یہ بات یہود و نصاریٰ کے حوالے سے کہی گئی ہے جو تورات اور انجیل کو دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے اور اس غرض سے جھوٹی قسمیں کھانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔اس لیے ہم لوگوں کا ذہن مطمئن رہتا ہے کہ ہمارا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔یہ ایک بہت مہلک غلط فہمی ہے' اسے دور کرنا ضروری ہے۔

اصولی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نہ تو تاریخ کی کتاب ہے اور نہ ہی تاریخ کا علم دینا اس کا مقصد ہے۔اس میں یہود و نصاریٰ اور دیگر اقوام کا ذکر ہماری ہدایت اور راہنمائی کی غرض سے کیا گیا ہے۔اس لیے ایسے مقامات کا مطالعہ کرتے وقت ضروری ہے کہ اپنے گریبان میں جھانک کر ایک مرتبہ ہم اپنا جائزہ ضرور لیں' ورنہ قرآن مجید سے ہدایت حاصل کرنے کا مقصد فوت ہو جائے گا۔یاد رکھیں کہ اس وقت بھی اگر آپ اس شیطانی چکر میں پڑ گئے کہ فلاں مولانا تو یہ کرتے ہیں اور فلاں عالم نے یہ کیا ہے' تو پھر آپ خود ہدایت سے محروم رہ جائیں گے۔اس لیے پہلے اپنا گریبان اور اپنی فکر' بعد میں دوسروں کی فکر۔

یہ اصول اگر سمجھ میں آ گیا ہے تو آیاتِ زیر مطالعہ کے حوالے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جانی چاہیے کہ یہود و نصاریٰ کے کچھ لوگوں نے تورات اور انجیل کے ساتھ جو سلوک کیا ہے وہی سلوک اگر ہم نے قرآن مجید کے ساتھ کیا تو ہمارا بھی وہی حشر ہو گا جو ایسے یہود و نصاریٰ کا ہونا ہے اور جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا منطقی دلیل کے علاوہ اس بات کی بہت واضح سند قرآن مجید میں موجود ہے۔سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۷۴ میں خطاب کا آغاز یٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ہوا ہے۔یعنی یہ خطاب براہِ راست ہم لوگوں سے ہے اور اسی تسلسل میں آیت ۱۷۴ میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ یقیناً جو لوگ اس کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے اتارا ہے' ان سے قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نہ تو کلام کرے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔اب کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔اس لیے ہر شخص کو اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ قرآن مجید کے کتنے حقوق ادا کر رہا ہے۔اس میں کوتاہی کے نتیجے پر ایک حدیث سے بھی روشنی پڑتی ہے۔سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۹ کی تفسیر میں ابن کثیر نے ایک بہت طویل حدیث نقل کی ہے جس کے آخر میں یہ ہے کہ آخری مرتبہ رسول اللہ ﷺ جب اپنے کچھ امتیوں کو دوزخ سے نکال کر لائیں گے تو فرمائیں گے کہ یا اللہ! اب تو وہاں پر وہ لوگ رہ گئے ہیں جنہیں قرآن نے روک رکھا ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کے خلاف قرآن کی حجت قائم ہو گئی وہ رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی شفاعت سے بھی محروم رہے گا۔

اب اپنے اوپر یہ لازم کرلیں کہ آپ معلوم کریں کہ قرآن مجید کے آپ پر کیا حقوق ہیں اور پھر اپنے مقدور بھر اس کی ادائیگی کی کوشش کریں تاکہ قیامت کے دن آپ یہ معذرت پیش کرسکیں کہ یا اللہ میں نے اپنے مقدور بھر کوشش کی تھی اور کوشش کے بعد تیری اس رحمت کا آسرا کیا تھا کہ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا

آیات ۷۹، ۸۰

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝﴾

د ر س

دَرَسَ (ن) دُرُوْسًا : کسی مٹنے والی چیز کا نشان باقی رہ جانا۔

دِرَاسَةً : کسی کتاب کا علم محفوظ کرنا' توجہ سے پڑھنا' سبق لینا' آیات زیر مطالعہ۔﴿وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ﴾ (الانعام:۱۵۶) ''اور بے شک ہم لوگ تھے ان سے سبق لینے سے غفلت برتنے والے۔''

ترکیب:''مَا كَانَ'' کی خبر محذوف ہے جو''جَائِزًا'' یا''مُنَاسِبًا'' ہوسکتی ہے۔''يَقُوْلَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ''اَنْ'' پر عطف ہے۔''وَلٰكِنْ'' کے بعد''يَقُوْلُ'' محذوف ہے۔''بِمَا'' کا ''بَا'' سببیہ ہے۔''وَلَا'' کے بعد''جَائِزٌ اَنْ'' محذوف ہے۔

ترجمہ:

وَمَا كَانَ :اور(جائز)نہیں ہے	لِبَشَرٍ :کسی بشر کے لیے
اَنْ :کہ	يُّؤْتِيَهُ :اس کو دے
اللّٰهُ :اللہ	الْكِتٰبَ :کتاب
وَالْحُكْمَ :اور حکمت	وَالنُّبُوَّةَ :اور نبوت
ثُمَّ :پھر	يَقُوْلَ :(یہ کہ)وہ کہے
لِلنَّاسِ :لوگوں سے	كُوْنُوْا :تم لوگ ہوجاؤ
عِبَادًا :بندے	لِّيْ :میرے لیے
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ :اللہ کے علاوہ	وَلٰكِنْ :اور لیکن (یعنی بلکہ وہ کہے)

كُوْنُوْا :تم لوگ ہو جاؤ	رَبَّانِيّٖنَ :ربّ والے
بِمَا :اس سبب سے کہ جو	كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ :تم لوگ تعلیم دیا کرتے ہو
الْكِتٰبَ :کتاب کی	وَبِمَا :اور اس سبب سے کہ جو
كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ :تم لوگ سبق لیا کرتے ہو	وَلَا :اور نہ ہی (جائز ہے کہ)
يَاْمُرَكُمْ :وہ حکم دے تم کو	اَنْ :کہ
تَتَّخِذُوا :تم لوگ بناؤ	الْمَلٰٓئِكَةَ :فرشتوں کو
وَالنَّبِيّٖنَ :اور نبیوں کو	اَرْبَابًا :(ج) ربّ، حاکم
اَيَاْمُرُكُمْ :کیا وہ حکم دے گا تم کو	بِالْكُفْرِ :کفر کا
بَعْدَ اِذْ :اس کے بعد کہ جب	اَنْتُمْ :تم لوگ
مُّسْلِمُوْنَ:مسلمان ہو	

آیات ۸۱، ۸۲

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

ترکیب :''لَمَا اٰتَيْتُكُمْ'' کا ''مَا'' موصولہ ہے اور اس پر لامِ تاکید ہے۔''قَالَ'' کا فاعل ''هُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ کے لیے ہے اور ''قَالُوْا'' کا فاعل ''هُمْ'' کی ضمیر ہے جو ''اَلنَّبِيّٖنَ'' کے لیے ہے۔''وَاَخَذْتُمْ'' میں حرفِ استفہام ''ءَ'' محذوف ہے اور اس کا مفعول ''اِصْرِىْ'' ہے۔

ترجمہ:

وَاِذْ :اور جب	اَخَذَ :لیا
اللّٰهُ :اللہ نے	مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ :نبیوں کا عہد (انبیاء سے)
لَمَآ :جو کچھ	اٰتَيْتُكُمْ :میں دوں تم لوگوں کو
مِّنْ كِتٰبٍ :کسی کتاب سے	وَّحِكْمَةٍ :اور کسی حکمت سے
ثُمَّ :پھر	جَآءَكُمْ :آئے تمہارے پاس
رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ :ایک تصدیق کرنے والا رسول	لِّمَا :اس کی جو

مَعَكُمْ :تمہارے پاس ہے	لَتُؤْمِنُنَّ :تو تم لوگ لازماً ایمان لاؤ گے
بِهٖ :اس پر	وَلَتَنْصُرُنَّهٗ : اور تم لوگ لازماً مدد کرو گے اس کی
قَالَ :(اللہ نے) کہا	ءَ :کیا
اَقْرَرْتُمْ :اقرار کیا تم لوگوں نے	وَاَخَذْتُمْ :اور (کیا) پکڑا تم لوگوں نے
عَلٰى ذٰلِكُمْ :اس پر	اِصْرِىْ :میرے عہد کو
قَالُوْٓا :(انبیاء نے) کہا	اَقْرَرْنَا :ہم نے اقرار کیا
قَالَ :(اللہ نے) کہا	فَاشْهَدُوْا :پس تم لوگ گواہ ہو جاؤ
وَاَنَا :اور میں	مَعَكُمْ :تمہارے ساتھ ہوں
مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ: گواہی دینے والوں میں سے	فَمَنْ : پھر جو
تَوَلّٰى :روگردانی کرے	بَعْدَ ذٰلِكَ اس کے بعد
فَاُولٰٓئِكَ تو وہ لوگ	هُمُ الْفٰسِقُوْنَ :ہی نافرمانی کرنے والے ہیں

نوٹ: دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جو انبیاء ورُسل f بھیجے ہیں' ان میں سے کچھ کا ذکر قرآن مجید میں ہے اور کچھ کا نہیں ہے (النساء:۱۶۴۔المؤمن:۷۸)۔قرآن مجید کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کبھی ایک سے زیادہ انبیاء مبعوث رہے ہیں' جیسے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون e یا حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ e۔ایک بستی والوں کا ذکر ہے جہاں بیک وقت تین انبیاء مبعوث ہوئے تھے (یٰسٓ:۱۴)۔لیکن زیادہ تر یہ ہوتا تھا کہ ایک نبی کے جانے کے بعد دوسرا نبی آتا تھا۔

اس پس منظر میں یہ بات سمجھ لیں کہ جو انبیاء f اپنے بعد میں آنے والے نبی کا زمانہ نہیں پاتے تھے وہ اپنی قوم کو ان کی آمد کی خبر اور نشانیاں بتا کر تاکید کر جاتے تھے کہ جب وہ آئیں تو تم لوگ لازماً ان پر ایمان لانا اور ان کی نصرت کرنا۔رسول کریم ﷺ سے پہلے تمام انبیاء ورُسلؑ کا یہ دستور رہا ہے۔تاریخِ انبیاء میں یہ پہلا اور واحد موقع ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بار بار اور انتہائی تاکید کے ساتھ خبر دی ہے کہ اب انؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ یہ آپؐ کے خاتم النبیین ہونے کا ایک بہت واضح ثبوت ہے۔

آیات ۸۳ تا ۸۵

﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۡ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ

يُقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٨٥﴾

ترکیب: ''يَبْغُوْنَ'' کا مفعول ''غَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ'' ہے اس لیے ''غَيْرَ'' منصوب ہے۔ ''طَوْعًا'' اور ''كَرْهًا'' حال ہیں۔ ''اِبْرٰهِيْمَ'' سے ''وَالْاَسْبَاطِ'' تک سب الفاظ ''عَلٰى'' پر عطف ہونے کی وجہ سے مجرور ہیں۔ ''مَنْ'' شرطیہ ہے اس لیے ''يَبْتَغِ'' مجزوم ہوا ہے۔ اس کا مفعول ''غَيْرَ الْاِسْلَامِ'' ہے اور ''دِيْنًا'' تمیز ہے۔

ترجمہ:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ :تو کیا اللہ کے دین کے علاوہ	يَبْغُوْنَ :وہ لوگ چاہتے ہیں
وَ :حالانکہ	لَهٗ :اس کا ہی
اَسْلَمَ :فرماں بردار ہوا	مَنْ :وہ، جو
فِي السَّمٰوٰتِ :آسمانوں میں ہے	وَالْاَرْضِ :اور زمین میں ہے
طَوْعًا :فرماں برداری کرتے ہوئے	وَّكَرْهًا :اور ناپسند کرتے ہوئے
وَّاِلَيْهِ :اور اس کی طرف ہی	يُرْجَعُوْنَ :وہ لوگ لوٹائے جائیں گے
قُلْ :آپؐ کہیے	اٰمَنَّا :ہم ایمان لائے
بِاللّٰهِ :اللہ پر	وَمَآ :اور اس پر جو
اُنْزِلَ :اُتارا گیا	عَلَيْنَا :ہم پر
وَمَآ :اور اس پر جو	اُنْزِلَ :اُتارا گیا
عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ :ابراہیمؑ پر	وَاِسْمٰعِيْلَ :اور اسمٰعیلؑ پر
وَاِسْحٰقَ :اور اسحاقؑ پر	وَيَعْقُوْبَ :اور یعقوبؑ پر
وَالْاَسْبَاطِ :اور (ان کی) نسل پر	وَمَآ :اور جو
اُوْتِيَ :دیا گیا	مُوْسٰى :موسیٰؑ کو
وَعِيْسٰى :اور عیسیٰؑ کو	وَالنَّبِيُّوْنَ :اور نبیوں کو
مِنْ رَّبِّهِمْ :ان کے رب (کی طرف) سے	لَا نُفَرِّقُ :ہم فرق نہیں کرتے
بَيْنَ اَحَدٍ :کسی ایک کے درمیان	مِّنْهُمْ :ان میں سے
وَنَحْنُ :اور ہم	لَهٗ :اس کے ہی
مُسْلِمُوْنَ :فرماں برداری کرنے والے ہیں	وَمَنْ :اور جس نے

يَّبْتَغِ: طلب کیا
غَيْرَ الْاِسْلَامِ :اسلام کے علاوہ کو
دِيْنًا :بطور دین کے
فَلَنْ يُّقْبَلَ :تو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا
مِنْهُ :اس سے
وَهُوَ :اور وہ
فِي الْاٰخِرَةِ : آخرت میں
مِنَ الْخٰسِرِيْنَ : خسارہ پانے والوں میں سے ہوگا

آیات ۸۶ تا ۸۹

﴿كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ وَلَا ھُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

ترکیب :''اَلْبَيِّنٰتُ'' صفت ہے۔اس کا موصوف ''اَلْاٰيٰتُ'' محذوف ہے جو کہ مؤنث غیر حقیقی ہے۔اس لیے فعل ''جَاءَتْ'' کے بجائے ''جَاءَ'' بھی درست ہے۔''اَلْمَلٰۗىِٕكَةِ'' اور ''اَلنَّاسِ'' مضاف الیہ ہونے کی وجہ سے مجرور ہیں۔ان کا مضاف ''لَعْنَةَ'' محذوف ہے اور یہ سب ''اَنَّ'' کا اسم ہیں اس لیے ''لَعْنَةَ'' منصوب ہے۔''اَنَّ'' کی خبر محذوف ہے اور ''عَلَيْهِمْ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔''اَلنَّاسِ'' کی تاکید ہونے کی وجہ سے ''اَجْمَعِيْنَ'' منصوب ہے۔ ''فِيْهَا'' کی ضمیر ''لَعْنَةَ'' کے لیے ہے۔ ''يُنْظَرُوْنَ'' باب افعال کا مضارع مجہول ہے۔

ترجمہ:

كَيْفَ : کیسے
يَهْدِي :ہدایت دے گا
اللّٰهُ :اللہ
قَوْمًا :ایسی قوم کو
كَفَرُوْا :جس نے کفر کیا
بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ :اپنے ایمان کے بعد
وَ :اس حال میں کہ
شَهِدُوْٓا :ان لوگوں نے گواہی دی
اَنَّ :کہ
الرَّسُوْلَ :یہ رسولؐ
حَقٌّ :برحق ہیں
وَّجَآءَهُمُ :اور آئیں ان کے پاس
الْبَيِّنٰتُ: واضح (نشانیاں)
وَاللّٰهُ :اور اللہ
لَا يَهْدِي :ہدایت نہیں دیتا
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ :ظلم کرنے والی قوم کو
اُولٰۗىِٕكَ یہ لوگ ہیں
جَزَاۗؤُھُمْ :جن کا بدلہ ہے

اَنَّ : کہ	عَلَيْهِمْ : ان پر ہے
لَعْنَةَ اللّٰهِ : اللہ کی لعنت	وَالْمَلٰٓئِكَةِ : اور فرشتوں کی
وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ : اور تمام لوگوں کی	خٰلِدِيْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہیں
فِيْهَا : اس (لعنت) میں	لَا يُخَفَّفُ : ہلکا نہیں کیا جائے گا
عَنْهُمُ : ان سے	الْعَذَابُ : عذاب
وَلَا هُمْ : اور نہ ہی ان کو	يُنْظَرُوْنَ : مہلت دی جائے گی
اِلَّا الَّذِيْنَ : سوائے ان لوگوں کے جنہوں نے	تَابُوْا : توبہ کی
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ اس کے بعد سے	وَاَصْلَحُوْا : اور اصلاح کی
فَاِنَّ : تو یقیناً	اللّٰهَ : اللہ
غَفُوْرٌ : بے انتہا بخشنے والا ہے	رَّحِيْمٌ : ہمیشہ رحم کرنے والا ہے

آیات ۹۰، ۹۱

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ● اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ﴾

ترکیب: ''اِزْدَادُوْا'' دراصل بابِ افتعال میں ''اِزْتَادُوْا'' تھا۔ پھر قاعدے کے مطابق ''تا'' کو ''دال'' میں تبدیل کیا گیا تو ''اِزْدَادُوْا'' استعمال ہوا۔ ''كُفْرًا'' اس کی تمیز ہے۔ ''يُقْبَلَ'' کا نائب فاعل ''مِلْءُ الْاَرْضِ'' ہے اور ''ذَهَبًا'' تمیز ہے۔ ''اُولٰئِكَ'' مبتدأ ہے۔ ''لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' پورا جملہ اس کی خبر ہے۔ اس جملہ میں ''عَذَابٌ اَلِيْمٌ'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے، خبر محذوف ہے اور ''لَهُمْ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔

ترجمہ:

اِنَّ الَّذِيْنَ : بے شک جن لوگوں نے	كَفَرُوْا : کفر کیا
بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ : اپنے ایمان کے بعد	ثُمَّ : پھر
ازْدَادُوْا : وہ لوگ زیادہ ہوئے	كُفْرًا : بلحاظ کفر کے
لَّنْ تُقْبَلَ : ہرگز قبول نہیں کی جائے گی	تَوْبَتُهُمْ : ان کی توبہ
وَاُولٰٓئِكَ اور وہ لوگ	هُمُ الضَّآلُّوْنَ ہی گمراہ ہونے والے ہیں

اِنَّ الَّذِیۡنَ : بے شک جنہوں نے	کَفَرُوۡا : کفر کیا
وَمَاتُوۡا : اور وہ مرے	وَ : اس حال میں کہ
هُمۡ : وہ	کُفَّارٌ : کافر (ہی) تھے
فَلَنۡ یُّقۡبَلَ : تو ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا	مِنۡ اَحَدِهِمۡ : ان کے ایک سے (بھی)
مِّلۡءُ الۡاَرۡضِ : زمین کے جتنا	ذَهَبًا : سونا
وَّ : اور	لَوِ : اگر (یعنی خواہ)
افۡتَدٰی : وہ خود کو چھڑائے دے کر	بِهٖ : اسے
اُولٰٓئِکَ : یہ لوگ ہیں	لَهُمۡ : جن کے لیے
عَذَابٌ اَلِیۡمٌ : ایک دردناک عذاب ہے	وَّمَا لَهُمۡ : اور جن کے لیے نہیں ہے
مِّنۡ نّٰصِرِیۡنَ : کوئی بھی مدد کرنے والا	

آیات ۹۲ تا ۹۴

﴿لَنۡ تَنَالُوا الۡبِرَّ حَتّٰی تُنۡفِقُوۡا مِمَّا تُحِبُّوۡنَ ۬ۙ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ شَیۡءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیۡمٌ ■ کُلُّ الطَّعَامِ کَانَ حِلًّا لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسۡرَآءِیۡلُ عَلٰی نَفۡسِهٖ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ تُنَزَّلَ التَّوۡرٰىةُ ؕ قُلۡ فَاۡتُوۡا بِالتَّوۡرٰىةِ فَاتۡلُوۡهَاۤ اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ □ فَمَنِ افۡتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الۡکَذِبَ مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ □﴾

ترکیب : ''وَمَا تُنۡفِقُوۡا'' کا ''مَا'' شرطیہ ہے اس لیے ''تُنۡفِقُوۡا'' مجزوم ہوا ہے۔ ''کَانَ'' کا اسم ''کُلُّ الطَّعَامِ'' ہے اور ''حِلًّا'' اس کی خبر ہے۔ ''حَرَّمَ'' کا فاعل ''اِسۡرَاءِیۡلُ'' ہے جو حضرت یعقوبؑ کا لقب ہے۔ ''اِفۡتَرٰی'' کا فاعل ''مَنۡ'' ہے اور ''اَلۡکَذِبَ'' اس کا مفعول ہے۔

ترجمہ:

لَنۡ تَنَالُوا : تم لوگ ہرگز نہیں حاصل کرو گے	الۡبِرَّ : نیکی کو
حَتّٰی : یہاں تک کہ	تُنۡفِقُوۡا : تم لوگ خرچ کرو
مِمَّا : اس میں سے جو	تُحِبُّوۡنَ : تم لوگ پسند کرتے ہو
وَمَا : اور جو بھی	تُنۡفِقُوۡا : تم خرچ کرو گے
مِنۡ شَیۡءٍ : کسی چیز میں سے	فَاِنَّ اللّٰهَ : تو یقیناً اللہ
بِهٖ : اس کو	عَلِیۡمٌ : جاننے والا ہے
کُلُّ الطَّعَامِ : کھانے کا کُل	کَانَ حِلًّا : حلال تھا

لِّبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ :بنواسرائیل کے لیے	اِلَّا :سوائے اس کے
مَا :جو	حَرَّمَ :حرام کیا
اِسۡرَآءِیۡلُ :اسرائیل (یعقوبؑ) نے	عَلٰی نَفۡسِہٖ :اپنے آپ پر
مِنۡ قَبۡلِ :اس سے پہلے	اَنۡ :کہ
تُنَزَّلَ :اُتاری جاتی	التَّوۡرٰىۃُ :تورات
قُلۡ :آپؐ کہیے	فَاۡتُوۡا :تو لاؤ تم لوگ
بِالتَّوۡرٰىۃِ :تورات کو	فَاتۡلُوۡھَآ :پھر پڑھو اس کو
اِنۡ :اگر	کُنۡتُمۡ :تم لوگ ہو
صٰدِقِیۡنَ :سچ کہنے والے	فَمَنِ :پھر جس نے
افۡتَرٰی :گھڑا	عَلَی اللّٰہِ :اللہ پر
الۡکَذِبَ :جھوٹ	مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِکَ :اس کے بعد سے
فَاُولٰٓئِکَ تو وہ لوگ	ھُمُ الظّٰلِمُوۡنَ :ہی ظالم ہیں

نوٹ: اسرائیل حضرت یعقوب d کا لقب ہے۔ ایک مرتبہ آپؑ سخت بیمار ہوئے تو منت مانی کہ صحت یاب ہونے پر اپنی سب سے محبوب چیز چھوڑ دوں گا۔ چنانچہ صحت یاب ہونے کے بعد انہوں نے اونٹ کے گوشت اور دودھ کا استعمال ترک کر دیا' کیونکہ یہ انہیں بہت پسند تھا۔ اس کے بعد ان کی اولاد نے بھی اسے اپنے اوپر حرام کر لیا۔ واضح رہے کہ اسلام میں کسی حلال چیز کو اپنے اوپر حرام کرنے کی منت ماننے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کی تفصیل' اِن شاءاللہ' سورۃ التحریم میں آئے گی۔

آیات ۹۵ تا ۹۷

﴿قُلۡ صَدَقَ اللّٰہُ ۟ فَاتَّبِعُوۡا مِلَّۃَ اِبۡرٰہِیۡمَ حَنِیۡفًا ؕ وَمَا کَانَ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّھُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۝ فِیۡہِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰہِیۡمَ ۚ وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡہِ سَبِیۡلًا ؕ وَمَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰہَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝﴾

ب ر ک

بَرَکَ (ن) بُرُوۡکًا :غیر حسی خیر اور بھلائی والا ہونا۔

بَرَکَۃٌ (اسم ذات) :غیر حسی خیر اور بھلائی' برکت (جو خیر اور بھلائی حواسِ خمسہ کے دائرے کے باہر ہو اور محسوس نہ کی جا سکے' اسے برکت کہتے ہیں۔ اردو میں بھی برکت ہی استعمال ہوتا ہے' کوئی دوسرا ہم

معنی لفظ نہیں ہے)۔﴿رَحۡمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکٰتُہٗ عَلَیۡکُمۡ اَھۡلَ الۡبَیۡتِ﴾ (ھود:۷۳) ''اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں تم لوگوں پر ہیں' اے اس گھر والو۔''

بَارَکَ (مفاعلہ) مُبَارَکَۃً : کسی کو برکت دینا' کسی پر برکت اتارنا۔﴿وَجَعَلَ فِیۡھَا رَوَاسِیَ مِنۡ فَوۡقِھَا وَبٰرَکَ فِیۡھَا﴾ (حٰمٓ السجدۃ:۱۰) ''اور بنائے اس (زمین) میں بھاری پہاڑ اس کے اوپر سے اور برکت دی اُس میں۔'' ﴿وَبٰرَکۡنَا عَلَیۡہِ وَعَلٰۤی اِسۡحٰقَ﴾ (الصّٰفّٰت:۱۱۳) ''اور ہم نے برکت اتاری اُس پر اور اسحاقؑ پر۔''

مُبَارَکٌ (اسم المفعول) : برکت دیا ہوا۔ آیت زیر مطالعہ۔

تَبَارَکَ (تفاعل) تَبَارُکًا : (۱) دوسرے کو برکت والا سمجھنا۔ یہ غیر اللہ کے لیے ہے اور اس مفہوم میں قرآن مجید میں استعمال نہیں ہوا۔ (۲) برکت کا سرچشمہ ہونا' بابرکت ہونا' یہ مفہوم صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔ ﴿تَبٰرَکَ اسۡمُ رَبِّکَ ذِی الۡجَلٰلِ وَالۡاِکۡرَامِ﴾ (الرحمٰن) ''برکت کا سرچشمہ ہوا تیرے رب کا نام جو جلال اور اکرام والا ہے۔''

ترکیب: ''حَنِیۡفًا'' حال ہے۔ ''اِنَّ'' کا اسم ''اَوَّلَ بَیۡتٍ'' ہے اور نکرہ مخصوصہ ہے۔ ''وُضِعَ لِلنَّاسِ'' اس کی خصوصیت ہے۔ ''لَـلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ'' خبر ہے۔ ''مُبَارَکًا'' اور ''ھُدًی'' حال ہے۔ ''مَقَامُ اِبۡرٰھِیۡمَ'' سے پہلے ''مِنۡھَا'' محذوف ہے۔ ''مَنۡ'' شرطیہ ہے۔ ''دَخَلَہٗ'' شرط اور ''کَانَ اٰمِنًا'' جواب شرط ہے۔ ''کَانَ'' کا اسم اس میں ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے اور ''اٰمِنًا'' اس کی خبر ہے۔ ''حِجُّ الۡبَیۡتِ'' مبتدأ مؤخر ہے' اس کی خبر ''وَاجِبٌ'' محذوف ہے اور ''لِلّٰہِ'' قائم مقام خبر مقدم ہے۔ ''مَنِ اسۡتَطَاعَ'' کا ''مَنۡ'' ''اَلنَّاسِ'' کا بدل ہے لیکن یہ بدلِ کل نہیں بلکہ بدلِ بعض ہے۔ یعنی تمام ''النّاس'' کا بدل نہیں ہے بلکہ ان میں سے کچھ کا بدل ہے۔

ترجمہ:

قُلۡ: آپؐ کہیے	صَدَقَ : سچ کہا
اللّٰہُ : اللہ نے	فَاتَّبِعُوۡا : پس تم لوگ پیروی کرو
مِلَّۃَ اِبۡرٰھِیۡمَ : ابراہیمؑ کے دین کی	حَنِیۡفًا : یکسو ہوکر
وَمَا کَانَ : اور وہ نہیں تھے	مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ : شرک کرنے والوں میں سے
اِنَّ : یقیناً	اَوَّلَ بَیۡتٍ : کوئی پہلا گھر جو
وُّضِعَ : رکھا گیا (یعنی بنایا گیا)	لِلنَّاسِ : لوگوں کے لیے
لَلَّذِیۡ : لازماً وہ ہے جو	بِبَکَّۃَ : مکہ میں ہے
مُبٰـرَکًا: برکت دیا ہوا ہوتے ہوئے	وَّھُدًی : اور ہدایت ہوتے ہوئے

لِّلۡعٰلَمِيۡنَ: تمام جہانوں کے لیے	فِيۡهِ : اس میں
اٰيٰتٌ ۢ بَـيِّنٰتٌ : کچھ واضح نشانیاں ہیں	مَّقَامُ اِبۡرٰهِيۡمَ : (ان میں سے) ابراہیمؑ کے کھڑے ہونے کی جگہ ہے
وَمَنۡ :اور جو	دَخَلَهٗ : داخل ہوگا اس میں
كَانَ :تو وہ ہوگا	اٰمِنًا :امن میں ہونے والا
وَلِلّٰهِ :اور اللہ کے لیے ہی ہے	عَلَى النَّاسِ :لوگوں پر
حِجُّ الۡبَيۡتِ :البیت (یعنی خانۂ کعبہ) کا حج	مَنِ :(ان میں سے)اس پر جو
اسۡتَطَاعَ :قدرت رکھتا ہو	اِلَيۡهِ:اس کی طرف
سَبِيۡلًا :راستے کی	وَمَنۡ :اور جس نے
كَفَرَ :انکار کیا	فَاِنَّ اللّٰهَ :تو بے شک اللہ
غَنِىٌّ :بے نیاز ہے	عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ :تمام جہانوں سے

نوٹ(۱): تورات میں حضرت ابراہیم d کے ہاتھوں جس بیت ایل (بیت اللہ) کی تعمیر کا ذکر ہے وہ خانۂ کعبہ ہی ہوسکتا ہے نہ کہ بیت المقدس (تدبر قرآن)۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بائبل ہی کی شہادت کے مطابق حضرت موسٰی d کے ۴۵۰ سال بعد حضرت سلیمان d نے بیت المقدس کو تعمیر کیا۔اس طرح یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ خانۂ کعبہ کی تعمیر نو بیت المقدس سے تقریباً ۱۲۔۱۳ سو سال پہلے ہوئی تھی۔

یہ بھی نوٹ کرلیں کہ حضرت ابراہیم d نے خانۂ کعبہ کو تعمیر نہیں کیا تھا بلکہ اس کی تعمیر نو کی تھی۔سورۃ البقرۃ‘ آیت ۱۲۷ میں واضح الفاظ میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل e نے خانۂ کعبہ کی بنیادوں کو بلند کیا تھا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ خانۂ کعبہ پہلے سے موجود تھا اور طوفانِ نوح میں اس کی دیواریں گر گئی تھیں۔ایک حدیث میں ہے کہ حضرت آدمؑ اور بی بی حوا نے خانۂ کعبہ تعمیر کیا اور طواف کیا۔ابن کثیرؒ نے اس حدیث کو ضعیف کہا ہے ۔لیکن اس بات میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ اس زمین پر لوگوں کے لیے تعمیر ہونے والی سب سے پہلی عبادت گاہ خانۂ کعبہ ہے۔جیسا کہ ایک صحیح روایت میں نبی اکرمﷺ کا فرمان ہے کہ سب سے پہلی مسجد جو روئے زمین پر تعمیر کی گئی ‘وہ مسجد حرام ہے اور دوسری مسجد بیت المقدس ہے اور ان دونوں کے درمیان چالیس سال کا وقفہ ہے۔

نوٹ(۲): حج کے لیے استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ راستہ محفوظ و مامون ہو‘ آدمی صحت مند ہو‘ حج پر جانے کا خرچہ موجود ہو اور غیر حاضری کے دوران پیچھے گھر والوں کے لیے کھانے پینے کا انتظام ہو۔جو شخص حج کی فرضیت کا انکار کرتا ہے وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے۔ایک شخص فرضیت کا انکار نہیں کرتا لیکن استطاعت کے باوجود حج نہیں کرتا تو وہ بھی اپنے عمل سے کافروں جیسا ہو جاتا ہے۔(معارف القرآن)

❁❁❁

فضائل اخلاق کی اہمیت

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: ((**اِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهٖ دَرَجَاتِ قَائِمِ اللَّيْلِ صَائِمِ النَّهَارِ**)) (رواہ احمد و ابوداؤد)

حضرت عائشہ k سے روایت ہے' فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپ ﷺ فرماتے تھے: ''صاحب ایمان بندہ اپنے اچھے اخلاق سے ان لوگوں کے درجات حاصل کر لیتا ہے جو رات بھر نفلی نمازیں پڑھتے ہوں اور دن کو روزہ رکھتے ہوں''۔

اس حدیث سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ جب کسی شخص کا عقیدہ صحیح اور عمل درست ہو تو اگرچہ ایسا شخص رات کے نوافل اور رمضان کے علاوہ روزے کثرت کے ساتھ نہ رکھتا ہو' مگر اُس کی شخصیت حسنِ اخلاق سے مزین ہو تو ایسا شخص عبادات میں سبقت لے جانے والے مؤمنین کی سی فضیلت حاصل کر لیتا ہے۔

حسن اخلاق انسان کے کردار اور رویے کو دلکش بناتا ہے اور ایسے آدمی کی شخصیت عوام الناس کے درمیان پرکشش اور ہر دل عزیز ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی اخلاقی خوبیوں کی بنا پر لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ ہمارے سچے اور حقیقی راہنما اللہ کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ جب ہم اُن کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں تمام فضائل اخلاق سے آراستہ پاتے ہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو' اللہ تعالیٰ نے انہیں بنی نوع انسان کے لیے نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھرپور زندگی بسر کی۔ آپؐ روزمرہ کے کام کاج میں حصہ لیتے' خرید و فروخت کرتے' ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کرتے' دوسروں کے ساتھ شائستہ انداز میں گفتگو کرتے' ساتھیوں کی تربیت کرتے' دشمنوں کے ناپاک عزائم سے باخبر اور ہوشیار رہتے' صحابہؓ کے ساتھ سنجیدہ گفتگو کرتے اور کبھی کبھی خوش طبعی بھی فرماتے۔ آپؐ اس رویے اور طرزِ عمل کے ساتھ ساتھ حقوق اللہ کی ادائیگی میں بھی پیش پیش تھے۔ پنجگانہ نمازوں کے علاوہ آپؐ رات کے اوقات میں نفل نمازیں بھی پڑھتے' رمضان کے روزے تو فرض ہیں' ان کے علاوہ بھی ہر مہینے کئی کئی دن نفل روزہ رکھتے۔ تاہم رات کے اوقات میں آرام بھی فرماتے۔ دن کو دوپہر کے وقت تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جانا بھی آپؐ کے معمول میں شامل تھا۔ چونکہ آپ ﷺ کی زندگی سراسر متوازن تھی اس لیے خالق کائنات نے ﴿**لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ**﴾ (الاحزاب:۲۱) ''تمہارے لیے رسول

اللہ (ﷺ) کی زندگی میں اچھا نمونہ موجود ہے'' کے الفاظ قرآن میں نازل فرما کر انسانوں کے لیے صراطِ مستقیم پر چلنے کا عملی مظہر فراہم کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کے مقصد بعثت کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کو شرفِ انسانیت سکھائیں اور شرفِ انسانیت فضائل اخلاق ہی کا دوسرا نام ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:((اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا))(۱) ''مجھے تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہے''۔ ان الفاظ کے ساتھ جہاں آپؐ نے معلمین کی عظمت واضح کی، وہاں اساتذہ کی ذمہ داری بھی بتا دی کہ وہ اپنے متعلمین کے لیے مثالی کردار کے حامل بنیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ))(۲) ''مجھے اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے''۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی فضائل اخلاق کی مظہر تھی۔ آپؐ نے اپنے ساتھیوں کی اس طرح تربیت کی کہ اُن میں سے ہر فرد اخلاقی خوبیوں سے متصف نظر آتا ہے۔

اس حدیث میں فضائل اخلاق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ بلاشبہ کثرت کے ساتھ نفلی روزے رکھنا اور رات کے اوقات میں عبادت کے لیے کھڑے ہونا بہت اچھے کام ہیں، مگر ان کاموں میں مصروف زندگی گزارنا خاصا مشکل کام ہے۔ البتہ جو آدمی نفلی نمازیں اور روزے تو زیادہ نہیں رکھتا مگر وہ اخلاقی خوبیوں سے متصف ہے تو وہ مرتبے اور مقام کے اعتبار سے اس شخص کے درجہ کو پالیتا ہے جو رات بھر نمازیں پڑھتا ہو اور دن کے وقت زیادہ تر روزہ رکھتا ہو۔

حضرت انس h کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ نے فرمایا: ''دیکھو ابھی ایک جنتی شخص آنے والا ہے''۔ تھوڑی دیر میں ایک انصاریؓ اپنے بائیں ہاتھ میں اپنی جوتیاں لیے ہوئے تازہ وضو کر کے آ رہے تھے۔ داڑھی پر سے پانی ٹپک رہا تھا۔ دوسرے دن بھی اسی طرح ہم بیٹھے ہوئے تھے کہ آپؐ نے یہی فرمایا اور وہی شخص اسی طرح آئے۔ تیسرے دن بھی یہی ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص i متجسس ہوئے کہ یہ انصاری صحابی، جنہیں آپؐ نے جنتی کہا ہے، کیا عمل کرتے ہیں۔ لہٰذا جب مجلس نبویؐ ختم ہوئی اور یہ بزرگ وہاں سے اٹھ کر چلے تو حضرت عبداللہ بن عمروؓ بھی ان کے پیچھے ہو لیے اور ان انصاری صحابیؓ سے کہنے لگے کہ حضرت! مجھ میں اور میرے والد میں کچھ تکرار ہو گئی ہے جس پر میں قسم کھا بیٹھا ہوں کہ تین دن تک اپنے گھر نہیں جاؤں گا۔ پس اگر آپ مہربانی فرما کر مجھے اجازت دیں تو میں یہ تین دن آپ کے ہاں گزار لوں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا۔ چنانچہ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے یہ تین راتیں ان کے ساتھ گزاریں۔ دیکھا کہ وہ رات کو تہجد کی لمبی نماز بھی نہیں پڑھتے۔ صرف اتنا کرتے ہیں کہ جب آنکھ کھلتی ہے تو اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی بڑائی اپنے بستر پر ہی لیٹے

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب المقدمة، باب فضل العلماء والحث على طلب العلم۔

(۲) موطا مالك، كتاب الجامع، باب انه قد بلغ ان رسول الله ﷺ قال بعثت لاتمم.....

لیٹے کر لیتے ہیں' یہاں تک کہ فجر کی نماز کے لیے اٹھ جاتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ میں نے ان کے منہ سے سوائے کلمہ خیر کے اور کچھ نہیں سنا۔ بہرحال جب تین راتیں گزر گئیں تو مجھے ان کا عمل بہت ہی ہلکا سا معلوم ہونے لگا۔ اب میں نے ان سے کہا کہ حضرت! دراصل نہ تو میرے اور میرے والد کے درمیان کوئی ایسی باتیں ہوئی تھیں نہ میں نے ناراضی کے باعث گھر چھوڑا تھا' بلکہ واقعہ یہ ہوا کہ تین مرتبہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ابھی ایک جنتی شخص آ رہا ہے اور تینوں مرتبہ آپ ہی تشریف لائے تو میں نے ارادہ کیا کہ آپ کی خدمت میں کچھ دن رہ کر دیکھوں تو سہی کہ آپ ایسی کون سی عبادتیں کرتے ہیں جو جیتے جی بزبانِ رسول آپ کے جنتی ہونے کی یقینی خبر ہم تک پہنچ گئی۔ چنانچہ میں نے یہ بہانہ بنایا اور تین رات تک آپ کی خدمت میں رہا تاکہ آپ کے اعمال دیکھ کر میں بھی ویسے ہی عمل شروع کر دوں' لیکن میں نے تو آپ کو نہ تو کوئی نیا عمل کرتے ہوئے دیکھا نہ عبادت ہی میں اَوروں سے زیادہ بڑھا ہوا دیکھا۔ اب میں جا رہا ہوں لیکن ایک سوال ہے کہ آپ ہی بتائیے آخر وہ کون سا عمل ہے جس نے آپ کو پیغمبر خدا ﷺ کی زبانی جنتی بنا دیا؟ انہوں نے کہا بس تم میرے اعمال کو دیکھ چکے' ان کے سوا اور کوئی خاص پوشیدہ عمل تو ہے نہیں۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرو اُن سے رخصت ہو کر چل دیے۔ تھوڑی ہی دور نکلے تھے کہ انہوں نے آواز دی اور فرمایا: ''ہاں' میرا ایک عمل سنتے جاؤ۔ وہ یہ کہ میرے دل میں کبھی کسی مسلمان سے دھوکہ بازی' حسد اور بغض کا ارادہ بھی نہیں ہوا۔ میں کبھی کسی مسلمان کا بدخواہ نہیں بنا''۔ حضرت عبداللہؓ نے یہ سن کر فرمایا کہ بس اب معلوم ہو گیا' اسی عمل نے آپ کو اس درجہ تک پہنچایا اور یہی وہ چیز ہے جو ہر ایک کے بس کی نہیں۔

جان لینا چاہیے کہ فضائل اخلاق نام ہے دوسروں کے ساتھ حسن سلوک کا۔ حضرت معاذ بن جبل h کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ((اَحْسِنْ خُلُقَکَ لِلنَّاسِ یَا مُعَاذُ بْنَ جَبَلٍ))(۳) ''اے معاذ! لوگوں کے لیے اپنے اخلاق کو بہتر بناؤ''۔ گویا اچھا انسان وہ ہے جو دوسروں کے لیے مفید ہو اور ہر کوئی اس کی اذیت سے مأمون ومحفوظ ہو۔

رحم دلی اچھی عادت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں پر رحم کرنے اور معاف کرنے کا درس دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((لَا یَرْحَمُ اللّٰهُ مَنْ لَا یَرْحَمُ النَّاسَ))(٤) ''وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت سے محروم رہیں گے جن کے دلوں میں دوسرے آدمیوں کے لیے رحم نہیں''۔ کسی انسان یا جانور کو تکلیف یا مشکل میں دیکھ کر اس کی مدد کے لیے آگے بڑھنا بہت بڑی نیکی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَضٰی لِاَحَدٍ مِنْ اُمَّتِیْ حَاجَةً یُرِیْدُ اَنْ یَّسُرَّهٗ بِهَا فَقَدْ سَرَّنِیْ وَمَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰهَ وَمَنْ سَرَّ اللّٰهَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ))(٥)

(۳) موطا مالك' كتاب الجامع' باب ما جاء فی حسن الخلق۔

(٤) صحيح البخاری' كتاب التوحيد' باب قول الله تبارك وتعالى قل ادعوا الله اوادعوا الرحمٰن۔

(٥) رواه البيهقی فی شعب الايمان۔

''جس نے میرے کسی اُمتی کی حاجت پوری کر دی' اس کا دل خوش کرنے کے لیے' تو اس نے مجھے خوش کیا' اور جس نے مجھے خوش کیا اس نے میرے اللہ کو خوش کیا اور جس نے اللہ کو خوش کیا اللہ اس کو جنت میں داخل فرمائے گا۔''

اللہ تعالیٰ ساری مخلوق کا کفیل ہے۔ وہ سب کا روزی رساں اور ضروریاتِ زندگی کو پورا کرنے والا ہے۔ تمام مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ پس جو آدمی اللہ کی مخلوق کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے وہ اللہ کا پسندیدہ بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلْخَلْقُ عَيَالُ اللّٰهِ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عَيَالِهِ))(٦)

''ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔ پس اللہ کو اپنی ساری مخلوق میں زیادہ محبت ان بندوں سے ہے جو اُس کی مخلوق کے ساتھ احسان کریں۔''

مشرکین مکہ نے رسول اکرم ﷺ پر اور آپؐ کے ساتھیوں پر اس قدر ظلم کیا کہ انہیں مکہ چھوڑ کر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ لیکن فتح مکہ کے موقع پر آپؐ نے عام معافی کا اعلان فرما کر کہ: ((فَاِنِّیْ اَقُوْلُ لَكُمْ مَا قَالَ يُوْسُفُ لِاِخْوَتِهٖ: لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ، اِذْهَبُوْا فَاَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ)(٧) ''میں تم سے وہی کہوں گا جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا: آج تمہارے اوپر کوئی گرفت نہیں جاؤ' پس تم آزاد ہو'' حسن اخلاق کا وہ نمونہ چھوڑا کہ دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ بدلہ لینے اور سزا دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کرنا اللہ کو بہت پسند ہے۔ ایثار و قربانی بہت بڑی اخلاقی خوبی ہے۔ یہ خوبی آپؐ کے کردار میں بدرجۂ اتم پائی جاتی تھی۔ آپؐ کئی کئی دن کے فاقے برداشت کر لیتے تھے لیکن دوسروں کے سوال کو کبھی ردّ نہ فرماتے تھے۔ آپؐ کے صحابہ کرام j میں بھی یہ خوبی نمایاں تھی کہ وہ اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے تھے۔ قرآن مجید میں مؤمنین صادقین کی ایک یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ: ﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:٩) ''وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں چاہے وہ خود تنگی میں ہوں (ضرورت مند ہوں)''۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ کی راہنمائی میں وہ معاشرہ وجود میں آیا جس کے افراد باہم شیر و شکر اور الفت و محبت کے رشتہ میں منسلک تھے۔ کسی دوسرے کی تکلیف کو گوارا نہ کرتے تھے' بلکہ خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کے لیے راحت کا سامان بہم پہنچاتے تھے۔ سیرت صحابہؓ میں اس قسم کے بے شمار واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔

غصہ انسان کی سرشت میں ہے' مگر غصے پر کنٹرول نہ کر سکنا اور آپے سے باہر ہو جانا رذائل اخلاق

---

(٦) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

(٧) یہ روایت کتب سیرت میں مختلف حوالوں سے نقل ہوئی ہے۔ علامہ البانیؒ نے ڈاکٹر سعید رمضان البوطی کی کتاب **فقه السيرة** پر اپنے نقد و تبصرے میں اسے ضعیف کہا ہے۔ ملاحظہ ہو: ص ٣٨٢۔

میں سے ہے۔ جبکہ غصے پر قابو پانا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ' اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِکُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ))(۸)

''پہلوان اور طاقتور وہ نہیں ہے جو مدمقابل کو پچھاڑ دے' بلکہ پہلوان تو درحقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔''

اللہ کی رضا کی خاطر غصہ پی جانے والوں کے لیے بشارت ہے کہ اللہ انہیں قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے لائیں گے اور ان کو اختیار دیں گے کہ حورانِ بہشت میں سے جس حور کو چاہیں اپنے لیے پسند کرلیں۔ (جامع ترمذی' سنن ابی داؤد)

باہم نفرت و عداوت' حسد اور بدگمانی' بغض اور کینہ' یہ سب رذائل اخلاق ہیں۔ ان سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نرم مزاجی' حلم و بردباری' خوش کلامی' صدق و امانت' قناعت و استغناء' شرم و حیا اور صبر و شکر اخلاقی خوبیاں ہیں جن کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

((اِنَّ اَثْقَلَ شَیْءٍ یُوْضَعُ فِیْ مِیْزَانِ الْمُؤْمِنِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ خُلُقٌ حَسَنٌ))(۹)

''قیامت کے دن مؤمن کی میزانِ عمل میں سب سے زیادہ وزنی اور بھاری چیز جو رکھی جائے گی وہ اس کے اچھے اخلاق ہوں گے''۔

حسن اخلاق میں یہ بھی ہے کہ اپنے مسلمان بھائی سے شگفتہ روئی کے ساتھ ملاقات کی جائے۔ اس کام میں نہ تو کوئی پیسہ خرچ ہوتا ہے اور نہ ہی کسی قسم کی تکلیف اٹھانی پڑتی ہے' جبکہ یہ بھی بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ کسی بھی نیکی کو حقیر نہ جانو۔ اگر تم اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی سے ملتے ہو تو یہ بھی ایک قابل قدر نیکی ہے۔

پس ہر مسلمان پر لازم ہے کہ وہ اخلاقی خوبیاں اپنائے۔ دوسروں کے لیے نیک اور مفید جذبات رکھے۔ کسی اخلاقی خوبی کو معمولی خیال نہ کرے اور رذائل اخلاق سے اپنے دامن کو بچا کر رکھے۔ oo

(۸) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحذر من الغضب۔ وصحیح مسلم' کتاب البر و الصلة والآداب' باب فضل من علیك نفسه عند الغضب.....

(۹) رواه البیهقی فی شعب الایمان۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت و تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ اس کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

فکرِ اعتزال

اور

عصر حاضر میں اس کے اثرات

حافظ طاہر اسلام عسکری ☆

زیر نظر تحریر 'الموسوعة الميسرة فی الادیان والمذاهب والاحزاب المعاصرة (جلد اوّل) سے ماخوذ ہے۔ یہ انسائیکلوپیڈیا الندوة العالمية للشباب الاسلامی کی طرف سے شائع ہوا ہے جس کی نگرانی ندوہ کے سیکرٹری جنرل ڈاکٹر مانع بن حماد الجہنی مرحوم نے کی ہے۔ 'الموسوعة الميسرة' میں سوا سو سے زائد اسلامی اور غیر اسلامی فرقوں، گروہوں اور تحریکوں کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ مضمون جسے 'فکر اعتزال اور عصرِ حاضر میں اس کے اثرات' کے عنوان سے پیش کیا جا رہا ہے' الموسوعة الميسرة کے مقالہ ''المعتزلة'' کی تفہیم و ترجمانی پر مشتمل ہے۔ بعض مقامات پر توضیح و تشریح کی غرض سے حواشی کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

بنیادی طور پر اس مضمون میں ایک قدیم بدعتی فرقے کا تعارف پیش کیا گیا ہے' لیکن اس کا ایک انتہائی مفید پہلو یہ ہے کہ اس میں ان افراد اور گروہوں کا تذکرہ بھی موجود ہے جو فی زمانہ انہی افکار و نظریات کے پرچارک ہیں جنہیں معتزلہ پیش کرتے تھے۔ اس سے زیر نظر مقالے کی افادیت دوچند ہو گئی ہے۔ چنانچہ جہاں اس کے مطالعے سے ایک پرانے فرقے سے متعلق معلومات میں اضافہ ہو گا وہیں موجودہ حالات میں اس فکر کے حاملین اور ان کے افکار و خیالات سے بھی آگاہی حاصل ہو گی۔ (ط۔ ا)

فرقۂ معتزلہ نے عہدِ بنی اُمیہ میں بال و پر نکالے اور عباسی خلافت کے زمانے میں عروج پایا۔ اسلامی عقیدے کے افہام و تفہیم میں اس کا انحصار محض عقل انسانی پر تھا' کیونکہ معتزلی باہر سے در آنے والے غیر اسلامی فلسفوں اور نظریوں سے متاثر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اہل السنّت والجماعت کے فکر و عقیدہ سے منحرف ہو گئے تھے۔ انہیں مختلف ناموں سے موسوم کیا جاتا ہے' مثلاً معتزلہ' قدریہ' عدلیہ' اہل العدل والتوحید' المقتصدہ اور الوعیدیہ۔

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

۞ تأسیس اور نمایاں شخصیات

اس امر میں علماء مختلف الخیال ہیں کہ مذہب اعتزال کیونکر ظہور پذیر ہوا؟ اس بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں:

● پہلا زاویۂ نظر یہ ہے کہ فکرِ اعتزال نے دینی عقائد کے مسائل میں بحث ومباحثہ کے نتیجے میں جنم لیا، جیسے یہ مسئلہ کہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب پر کیا حکم لگایا جائے یا مسئلہ تقدیر میں یہ گفتگو کہ کیا انسان قدرت رکھتا ہے یا نہیں۔

اس رائے کے حاملین کے مطابق 'معتزلہ' نام رکھے جانے کے درج ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:

(۱) یہ لوگ اپنے نظریے المنزلة بين المنزلتين کی بنا پر مسلمانوں سے کنارہ کش ہو گئے تھے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کفر واسلام میں ایک درمیانی درجہ بھی ہے۔

(۲) یہ لوگ معتزلہ کے نام سے اس وقت معروف ہوئے جب واصل بن عطا نے سیدنا حسن بصریؒ کے حلقہ درس سے علیحدگی اختیار کر لی اور منزلة بين المنزلتين کے قول کی بنا پر اپنا الگ حلقہ قائم کر لیا۔ اس پر حسن بصری نے فرمایا: اعتزلَنا واصِلٌ 'واصل ہم سے علیحدہ ہو گیا'۔

(۳) یا اس بنا پر کہ ان کے نزدیک مرتکب کبیرہ سے مقاطعہ اور کنارہ کشی کرنا واجب تھا۔

● دوسرا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ معتزلی اندازِ فکر سیاسی اسباب کی وجہ سے منظر عام پر آیا، کیونکہ یہ لوگ سیدنا علی h کے گروہ میں شامل تھے لیکن جب سیدنا حسن h سیدنا معاویہ h کے حق میں منصبِ خلافت سے دستبردار ہو گئے تو انہوں نے سیدنا حسنؓ سے کنارہ کشی اختیار کر لی، یا یہ کہ معتزلی سیدنا علیؓ اور سیدنا معاویہؓ کے مابین غیر جانبدارانہ پالیسی رکھتے تھے، لہٰذا دونوں گروہوں سے الگ ہو گئے۔

● یہ تو تھیں فکر اعتزال کے بارے میں اہل علم کی آراء، لیکن مؤرخِ معتزلہ قاضی عبدالجبار الہمدانی کا کہنا ہے کہ یہ نہ کوئی جدید مذہب ہے نہ کوئی نیا گروہ یا فرقہ، بلکہ اسی فکر وعقیدے کا تسلسل ہے جس پر رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام j کاربند تھے۔ ان کا یہ نام یعنی معتزلہ تو اس لیے ہے کہ یہ شر سے کنارہ کش ہو گئے ہیں، کیونکہ قرآن شریف میں ہے کہ:

﴿وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ.....﴾(مریم:٤٨)

''اور میں تم (سب) سے اور ان (بتوں) سے جنہیں تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، کنارہ کش ہوتا ہوں۔''

اور فرمانِ نبویؐ ہے:

((مَنِ اعْتَزَلَ الشَّرَّ سَقَطَ فِي الْخَيْرِ))(۱)

(۱) واضح رہے کہ تلاشِ بسیار کے باوجود ذخیرۂ حدیث میں اس روایت کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا۔

''جو شر سے علیحدہ ہو گیا' اس نے خیر حاصل کر لی۔''

● واقعہ یہ ہے کہ مکتبِ اعتزال کا وجود بنیادی افکار و عقائد میں ان تاریخی تغیرات کا نتیجہ تھا' جو دینی نصوص میں محض عقلی بحث و نظر کی بنا پر ظہور پذیر ہوئے۔ یہ اسلام میں ایک اجنبی اور نومولود فکر تھا جو فلسفہ یونان و ہند اور عقائدِ یہود و نصاریٰ سے تأثر پذیری کا شاخسانہ تھا' جس کا تذکرہ آگے آ رہا ہے۔

● واصل بن عطا کے ہاتھوں معتزلی مکتبِ فکر کی تشکیل سے قبل بعض نزاعی مسائل کی بنا پر مذہبی افکار میں بحث و جدل کا آغاز ہو چکا تھا۔ یہی آراء و نظریات دراصل فرقہ معتزلہ کی اوّلین اساس و بنیاد ہیں۔ وہ افکار کیا تھے اور ان کے حاملین کون تھے' اس کا انتہائی مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے:

..... ایک نظریہ یہ تھا کہ انسان کلی طور پر آزاد اور خود مختار ہے اور اپنے افعال کا خود ہی خالق ہے۔ اسے معبد الجہنی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے' جس نے عبدالرحمٰن بن الاشعث کے ساتھ مل کر عبدالملک بن مروان کے خلاف خروج کیا تھا۔ لیکن تحریکِ بغاوت ناکام ہو جانے کے بعد ۸۰ھ میں حجاج بن یوسف کے ہاتھوں قتل ہوا۔

..... سیدنا عمر بن عبدالعزیز m کے زمانے میں غیلان الدمشقی نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا۔ اسے ہشام بن عبدالملک نے قتل کروا دیا تھا۔

..... جہم بن صفوان نے قرآن کریم کے مخلوق ہونے اور صفاتِ الٰہیہ کی نفی کا تصور پیش کیا اور ۱۲۸ھ میں بمقام مرو' سالم بن احور کے ہاتھوں قتل ہوا۔

..... صفاتِ باری تعالیٰ کا انکار کرنے والوں میں جعد بن درہم کا نام بھی بڑا نمایاں تھا۔ اسے والیٔ کوفہ خالد بن عبداللہ القسری نے عیدالاضحیٰ کے دن ذبح کر دیا تھا۔

● بعد ازاں معتزلہ فرقہ باقاعدہ ایک مکتب خیال کے طور پر سامنے آیا۔ اس فرقے کا بانی واصل بن عطا الغزال (۸۰ھ۔۱۳۱ھ) تھا جو کہ امام حسن بصریؒ کے حلقۂ تلمذ میں شامل تھا' لیکن پھر اپنے اس موقف کی بنا پر ان سے علیحدہ ہو گیا تھا کہ کبیرہ گناہ کرنے والا انسان کفر و اسلام کے مابین ایک درمیانی درجہ میں ہوتا ہے' یعنی وہ مسلمان ہوتا ہے نہ کافر' اور اگر موت سے پہلے توبہ نہ کر سکا تو وہ دائمی جہنمی ہو گا۔ واصل نے عبدالملک بن مروان اور ہشام بن عبدالملک کا زمانہ پایا ہے اور اس کی طرف منسوب معتزلی فرقہ ''الواصلیۃ'' کے نام سے معروف ہوا۔

● معتزلہ چونکہ عقائد کے افہام و تفہیم میں عقل پر اعتماد کرتے تھے اور جزئی مسائل میں بال کی کھال اتارنے کے عادی تھے' لہٰذا وہ کئی گروہوں میں بٹ گئے تھے' اگرچہ پانچ بنیادی اصولوں پر ان کا اتفاق تھا۔ ان اصولوں کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ ان میں سے ہر فرقہ چند نئی بدعتیں متعارف کراتا' جن کی بنا پر وہ دیگر گروہوں سے ممتاز و متمیز ہو جاتا۔ ان فرقوں کا نام ان سرغنوں کے ناموں پر رکھا جاتا جن سے وہ فاسد

اصول وعقائد اخذ کیے جاتے تھے۔

● عباسی خلیفہ مامون الرشید کے عہد میں معتزلہ نمایاں ہوکر سامنے آئے' کیونکہ مامون نے بشر مریسی' ثمامہ بن اشرس اور احمد بن ابوداؤد کی تعلیمات سے متأثر ہوکر معتزلی مذہب اختیار کرلیا تھا۔ احمد بن ابی داؤد اپنے زمانے میں مسلک اعتزال کا مرکزی رہنما اور نمایاں لیڈر تھا۔ یہ خلق قرآن کے فتنہ میں بھی پیش پیش تھا۔ المعتصم کے عہد حکومت میں اسے چیف جسٹس (قاضی القضاۃ) کا منصب سونپ دیا گیا تھا۔

فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں امام احمد بن حنبل m کو شدید مصائب ومشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ حضرت الامامؒ نے مامون کے احکامات کو ٹھکراتے ہوئے اس بدعت کو ماننے سے انکار کردیا تھا' چنانچہ آپ کو قید وبند کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ امام صاحب کو سخت سزائیں دی گئیں اور مامون کی وفات کے بعد معتصم کے دورِ اقتدار میں کوڑوں سے پیٹا گیا۔ آپؒ اڑھائی برس تک پس دیوارِ زنداں رہے۔ بعدازاں المعتصم اور اس کے فرزند واثق باللہ کے تمام تر زمانہ حکومت میں آپ کو گھر میں نظر بند رکھا گیا۔

۲۳۲ھ میں جب المتوکل مسند خلافت پر متمکن ہوا تو اس نے اہل سنت کو اس ظلم وستم سے نجات دلائی اور امام احمد m سے اعزاز واکرام سے پیش آیا۔ المتوکل نے حکومت پر چودہ برس سے جاری معتزلہ کے تسلط کو ختم کرکے لوگوں پر بزور وجبر اپنے عقائد ونظریات تھوپنے کی کوششوں کا خاتمہ کردیا۔ یوں ظلم وتشدد کا دَور ختم ہوا اور لوگوں کو فکر ونظر کی آزادی مل گئی۔

● سلطنت بنی بویہ کے زمانے میں ۳۳۴ھ کے لگ بھگ سرزمین فارس میں شیعہ اور معتزلہ میں مضبوط ومستحکم تعلقات استوار ہوئے۔ یہ ایک شیعی مملکت تھی۔ اس کے زیر سایہ فکر اعتزال کی قدر ومنزلت میں بہت اضافہ ہوا اور مؤید الدولۃ البویہی کے وزیر صاحب بن عباد نے ۳۶۰ھ میں قاضی عبدالجبار کو الری کا جج مقرر کردیا' جو کہ اپنے زمانے میں اعتزالی فکر کا سرغنہ تھا۔ صاحب بن عباد' معتزلی اور رافضی عقائد کا حامل تھا۔ امام ذہبیؒ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

وکان شیعیا معتزلیا مبتدعا ''یہ شیعہ' معتزلی اور بدعتی تھا''۔

علامہ مقریزیؒ رقم طراز ہیں کہ:

ان مذھب الاعتزال فشا تحت ظل الدولۃ البویھیۃ فی العراق وخراسان وماوراء النھر

''بویہی سلطنت کے زیر سایہ معتزلی مذہب عراق' خراسان اور ماوراء النہر کے علاقوں میں عام ہوگیا''۔

اسی زمانے میں الشریف المرتضیٰ کا نام بھی نمایاں ہوکر سامنے آیا۔ اس کے بارے میں امام ذہبیؒ کہتے ہیں:

وکان من الاذکیاء والاولیاء المتبحرین فی الکلام والاعتزال والادب والشعر لکنہ امامی جلد

''یہ انتہائی ذہین تھا۔ اسے علم کلام' اعتزال اور ادب وشعر میں تبحر اور مہارتِ تامہ حاصل تھی' لیکن

پکا شیعہ تھا۔''

● اس کے بعد ایک مستقل مکتب خیال کے طور پر فکر اعتزال کا تقریباً خاتمہ ہی ہو گیا۔ اگرچہ بعض ایسے گروہوں میں یہ موجود رہا جنہوں نے معتزلہ سے ان کے نظریات اخذ کر لیے تھے' مثلاً شیعہ وغیرہ۔

موجودہ زمانے میں اعتزالی فکر بعض دانشوروں اور قلم کاروں کے ذریعے از سرِ نو زندہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگ جدید عقلی مدرسۂ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں' اس پر تفصیلی بحث آگے چل کر ''جدید فکر اعتزال'' کے زیرِ عنوان ہو گی۔

● واصل بن عطا کے ہاتھوں معتزلی مکتب فکر کی تأسیس سے لے کر اس کے خاتمے اور دیگر مذاہب مثلاً شیعہ' اشاعرہ اور ماتریدیہ میں تحلیل ہو جانے تک' اس فرقے کے نمایاں مفکرین درج ذیل ہیں:

☆ **ابو الہذیل حمدان بن الہذیل العلاف (۱۳۵ھ۔۲۲۶ھ)**: یہ عبدالقیس کا آزاد کردہ غلام تھا۔ شیخ المعتزلہ تھا اور ان کی حمایت میں مناظرے کیا کرتا تھا۔ اس نے بواسطہ عثمان بن خالد الطّویل' واصل بن عطا سے معتزلی مذہب اختیار کیا۔ اس نے فلسفے کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا اور معتزلہ کے افکار میں فلاسفہ کے نظریات کی آمیزش کر دی۔ یہ ارسطو اور انباذقلیس سے متأثر تھا۔ یہ دونوں فلاسفہ یونان سے تعلق رکھتے تھے۔ العلاف کا کہنا تھا کہ **اللّٰہ عالم بعلم وعلمه ذاته' وقادر بقدرة وقدرته ذاتهٗ** 'اللہ علم کے ساتھ عالم ہے اور اس کا علم اس کی ذات ہی ہے' اور وہ قادر ہے قدرت کے ساتھ اور اس کی ذات ہی اس کی قدرت ہے''۔ (الفرق بین الفرق للبغدادی' ص ۷۶) یعنی صفاتِ باری تعالیٰ کو عین ذات قرار دیتا تھا۔ اس سے منسوب معتزلی فرقہ **الهذيلية** کہلاتا تھا۔

☆ **ابراہیم بن یسار بن ہانی النظام (متوفی ۲۳۱ھ)**: نظام درحقیقت براہمہ (ہندوؤں کی ذات برہمنی) کے دین پر تھا۔ دیگر معتزلیوں کی طرح یہ بھی یونانی فلسفے سے مرعوب و متأثر تھا۔ اس کا نقطۂ نظر تھا کہ **المتولدات من افعال اللّٰہ تعالیٰ** ''متولدات اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ہیں''۔ اس کی طرف **النظامية** فرقہ منسوب تھا۔

☆ **بشر بن المعتمر (متوفی ۲۲۶ھ)**: یہ معتزلہ کے علماء میں شمار ہوتا تھا۔ اسی نے تولد [۲] کا نظریہ ایجاد کیا اور اس میں خوب مبالغہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ:

(۲) تولد کے لغوی معنی ہیں: ''ایک شے کا دوسری سے نکل کر تیار ہونا''۔ (القاموس الوحید: ص ۱۸۹۶) بعض معتزلہ کا نقطۂ نگاہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا متولدات میں کوئی دخل نہیں بلکہ ان میں اصل مؤثر علت ہے۔ جیسے بارش بادلوں سے برستی ہے۔ جبکہ اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ تمام امور میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و تصرف کارفرما ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ کارخانۂ عالم بنا کر اس سے لاتعلق ہو گیا ہے اور اب سارا نظام محض علت و معلول کے باہمی تعلق پر چل رہا ہے۔ البتہ یہ بالکل درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض اشیاء کو دیگر کے لیے مؤثر علت بنا دیا ہے۔

ان کل المتولدات من فعل الانسان فهو یصح ان یفعل الالوان والطعوم والرؤیة والروائح

''تمام متولدات انسان کا فعل ہیں' لہٰذا یہ درست ہے کہ رنگوں' ذائقوں' مرئیات اور مہکوں کا ظہور انسان سے بطور تولد ہو''۔

البشریة نامی فرقے کی نسبت اسی کی طرف تھی۔

☆**معمر بن عباد السلمی (متوفی ۲۲۰ھ)**: یہ شخص صفاتِ الٰہیہ کی نفی اور اس امر کے انکار کی تدقیق وتحقیق میں کہ خیر وشر کی تقدیر منجانب خدا ہے' تمام اہلِ اعتزال میں نہایت نمایاں ہے۔ اس کی طرف منسوب فرقے کا نام **المعمریة** تھا۔

☆**عیسیٰ بن صبیح المردار (متوفی ۲۲۶ھ)**: اس کی کنیت ابوموسیٰ اور لقب ''مردار'' تھا۔ اسے ''راہب المعتزلہ'' کہا جاتا تھا کہ زہد وعبادت میں ممتاز تھا۔ یہ تکفیر کے باب میں بہت تیز اور جلد باز تھا' حتیٰ کہ اس نے ساری اُمت پر کفر کا فتویٰ لگا دیا اور معتزلہ بھی اس کی کافرگری سے محفوظ نہ رہ سکے۔ اس کے گروہ کو ''**المردارية**'' کا نام دیا گیا۔

☆**ثمامہ بن اشرس النمیری (متوفی ۲۱۳ھ)**: اس کی ذات قلتِ دین اور کردار کی بے شرمی و بے حیائی کا مجموعہ تھی۔ اس کا اعتقاد تھا کہ اگر فاسق آدمی اپنے فسق پر بغیر توبہ مر جائے تو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں رہے گا اور دنیا میں ایسا شخص کفر واسلام کے مابین ایک درمیانی مقام پر ہوگا' یعنی نہ مؤمن ہوگا نہ کافر۔

مامون' معتصم اور واثق کے عہد ہائے خلافت میں ثمامہ بن اشرس کو معتزلہ کے قائد اور لیڈر کی حیثیت حاصل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی نے مامون کو گمراہ کیا اور اسے عقیدۂ اعتزال اپنانے کی دعوت دی۔ اس کا فرقہ **الثمامیة** کہلاتا تھا۔

☆**ابوعثمان الجاحظ (متوفی ۲۵۱ھ)**: اس کا نام عمرو بن بحر ہے۔ اسے معتزلہ کے عظیم مصنفین اور کتب فلاسفہ پر گہری نظر رکھنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کی ادبی تحریروں میں فصاحت و بلاغت کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ اپنی نگارشات میں معتزلی افکار وتصورات کو پرفریب انداز میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے نظریات اپنی تحریروں میں یوں سمو دیے ہیں جیسے زہر گوشت پوست میں سرایت کر جاتا ہے۔ جیسا کہ اس کی کتاب ''**البیان التبیین**'' کے گہرے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی جانب منسوب فرقے کو **الجاحظیة** کہا جاتا تھا۔

☆**ابوالحسین بن ابی عمر الخیاط (متوفی ۲۵۶ھ)**: یہ معتزلۂ بغداد میں سے ہے۔ یہ اپنی جس بدعت کی بنا پر متفرد تھا وہ یہ تھی کہ معدوم جسم ہے اور معدوم شے اپنے وجود سے قبل بھی جسم تھی۔ یہ نظریہ دراصل عالم کے قدیم ہونے کی تصریح ہے۔ اس عقیدے میں یہ شخص تمام معتزلہ کا مخالف تھا۔ اس کے فرقے کا نام ''**الخیاطیة**'' تھا۔

☆ القاضی عبدالجبار الہمدانی (متوفی ۴۱۴ھ): اس کا شمار متأخرین معتزلہ میں ہوتا ہے۔ یہ 'الرّی' کا چیف جسٹس تھا اور اپنے زمانے میں اہل اعتزال کے شیخ و استاذ کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس نے معتزلہ کی تاریخ لکھی اور معتزلی فکر و عقیدہ کے اصول و مبادی کو منظّم و مرتب انداز میں پیش کیا ہے۔

۞ افکار و عقائدِ معتزلہ

اپنے بالکل ابتدائی دور میں معتزلہ نے بدعت پر مبنی دو نظریے پیش کیے:

● ایک یہ کہ انسان اپنے تمام افعال میں بااختیار ہے اور وہ خود ہی اپنے افعال کا خالق ہے' اسی لیے اسے مکلّف قرار دیا گیا ہے۔ اس عقیدے کے حاملین میں ایک نمایاں نام غیلان الدمشقی کا تھا۔ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے عہدِ خلافت میں بڑی سرگرمی سے اپنے اس نظریے کی دعوت دینا شروع کی' تا آنکہ ہشام بن عبدالملک کا دورِ حکومت آ گیا اور یہ اپنے اس بدعتی عقیدے کی پاداش میں ہشام کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے انجام کو پہنچا۔

● دوسرا یہ کہ گناہِ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا انسان نہ مؤمن ہوتا ہے اور نہ کافر' بلکہ وہ فاسق ہوتا ہے۔ گویا وہ **منزلة بين المنزلتين** یعنی کفر و اسلام کے مابین ایک درمیانی درجہ میں ہوتا ہے۔ یہ تو دنیا میں ہے۔ جہاں تک آخرت کا معاملہ ہے تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا' کیونکہ اس نے اہل جنت کے سے اعمال نہیں کیے' لہٰذا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخی ہے۔ ان کے نزدیک ایسے شخص کو مسلمان کہنے میں کوئی مانع نہیں' کیونکہ وہ ظاہری طور پر اسلام سے وابستہ ہے اور شہادتین کا اقراری ہے' لیکن اسے مؤمن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ (۳)

اس کے بعد معتزلہ نے اپنے مذہب کو منضبط و منظّم شکل میں پیش کیا اور اس کے پانچ بنیادی اصول قرار دیے:

(۱) توحید (۲) عدل (۳) وعد اور وعید
(۴) **منزلة بين المنزلتين** (۵) امر بالمعروف و نہی عن المنکر (۴)

(۳) شیعہ معتزلی ابن ابی الحدید نے 'شرح نہج البلاغۃ' میں لکھا ہے کہ ''گو ہمارا عقیدہ ہے کہ مرتکب کبائر نہ مؤمن ہے نہ مسلم' لیکن ہم اس کے لیے لفظ 'مسلم' کا اطلاق جائز خیال کرتے ہیں تاکہ اہل ذمہ اور بت پرستوں سے اسے ممتاز کیا جا سکے۔ لہٰذا یہ لفظ مرتکب کبائر کے لیے ایسی احتیاط سے استعمال کیا جائے گا کہ اس سے اس کی تعظیم و ثنا اور مدح نہ سمجھی جائے''۔ (بحوالہ اسلامی مذاہب' از شیخ ابوزہرہ مصریؒ' مترجم غلام احمد حریریؒ' ص ۲۲۱' طبع سوم)

(۴) الخیاط معتزلی کے مطابق کوئی شخص اس وقت تک معتزلی نہیں کہلا سکتا جب تک ان اصولِ خمسہ کا اقرار نہ کرے۔ (الانتصار للخیاط: ص ۱۲۶)

اب ان اصولِ خمسہ کی وضاحت کی جاتی ہے:

(۱) توحید: توحید کے باب میں ان کے نقطۂ نظر کا خلاصہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ مخلوق سے ہر قسم کی مشابہت ومماثلت سے پاک ہے۔ جیسا کہ قرآن شریف میں ہے:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾(الشوریٰ:۱۱)

''اس کی مانند کوئی شے بھی نہیں ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی بادشاہت وسلطنت میں کوئی اس کا ہمسر اور مقابل نہیں۔ اس پر وہ اصول وضوابط لاگو نہیں ہوتے جن کی مخلوق پابند ہے۔

بلاشبہ یہ عقیدہ برحق ہے' لیکن معتزلہ نے اس سے کچھ ایسے نتائج اخذ کر لیے جو قطعی طور پر باطل ہیں' مثلاً:

..... باری تعالیٰ کا دیدار ناممکن ہے' کیونکہ یہ نفیٔ صفات کا لازمی تقاضا ہے۔

..... ذات اور صفات میں کوئی فرق نہیں' یہ دونوں ایک ہی شے ہیں' کیونکہ اگر صفات کو بھی الگ اور مستقل حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے تو ان کی نظر میں تعددِ قدماء لازم آئے گا۔ اسی بنا پر انہیں منکرین صفاتِ الٰہیہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

..... نفیٔ صفات کے اصول ہی کی بنا پر معتزلہ قرآن شریف کو مخلوق کہتے ہیں' کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ کلام کو تسلیم نہیں کرتے۔

(۲) عدل: ان کے نزدیک عدل سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کے افعال کا خالق نہیں اور نہ وہ فساد کو پسند فرماتا ہے' بلکہ لوگ وہ کام کرتے ہیں جن کا انہیں حکم دیا گیا ہے اور ان امور سے باز رہتے ہیں جن سے انہیں روکا گیا ہے۔ ان افعال کی بنیاد اس طاقت وقدرت پر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا کی ہے اور ان میں ودیعت کر رکھی ہے۔ خدا تعالیٰ محض اسی شے کا حکم دیتا ہے جس کا وہ ارادہ کرتا ہے اور صرف اسی سے روکتا ہے جو اسے ناپسند ہے۔ وہ ہر اس اچھے کام کو پسند فرماتا ہے جس کا اس نے حکم دیا ہے اور ہر اس برائی سے بریٔ الذمہ ہے جس سے اس نے منع فرما دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ایسی ذمہ داری نہیں ڈالتا جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں اور نہ ان سے کسی ایسے کام کی خواہش رکھتا ہے جو اُن کی قدرت سے باہر ہو۔

اس باب میں معتزلہ کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے باری تعالیٰ کے ارادۂ کونیہ اور ارادۂ شرعیہ کو خلط ملط کر دیا اور ان میں امتیاز نہ کر سکے۔ (۵)

---

(۵) یہاں یہ امر واضح رہے کہ اہل سنت بھی ''عدل'' کے قائل ہیں لیکن ان کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں عادل ہے۔ وہ اپنی مخلوق میں اپنی مشیت وحکمت علم کے مطابق تصرف فرماتا ہے اور ہر طرح کے جور وظلم سے منزہ اور پاک ہے۔ لیکن معتزلہ نے عدل کا تصور یہ پیش کیا کہ اس سے مراد وہ حکمت ہے جو تقاضائے عقل ہو۔ اس سے انہوں نے کئی غلط نتائج اخذ کر ڈالے۔ مثلاً اللہ صرف خیر ہی کا ارادہ ☜

(۳) وعدا ور وعید: اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نیکی کرنے والے کو اچھا اور برائی کرنے والے کو برا بدلہ دے گا اور مرتکب کبیرہ کو معاف نہ فرمائے گا' اِلا یہ کہ وہ توبہ کرلے۔[٦]

(٤) منزلة بين المنزلتين: معتزلہ کا کہنا ہے کہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ایمان اور کفر کے مابین ایک درمیانی درجے میں ہوتا ہے' یعنی وہ مؤمن ہوتا ہے نہ کافر۔ یہ نظریہ شیخِ معتزلہ واصل بن عطا نے وضع کیا تھا۔

(۵) امر بالمعروف ونہی عن المنکر: معتزلیوں کے مطابق امر بالمعروف ونہی عن المنکر تمام اہلِ ایمان پر واجب ہے تاکہ دعوتِ اسلامی کی نشر واشاعت کی جا سکے' گمراہوں کو راہِ راست پر لایا جا سکے اور بھٹکے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کی جا سکے۔ یہ فریضہ ہر شخص پر بقدرِ استطاعت ہی عائد ہوگا۔ پس جو زبان و بیان کی صلاحیت رکھتا ہے وہ اس کے ذریعے دین کی دعوت کا فریضہ سرانجام دے گا۔ اسی طرح عالم اپنے علم سے اور صاحبِ سیف وسنان تیر وتلوار کے ذریعے اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ معتزلہ اپنے اس اصول کی بنا پر اُن حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے قائل تھے جو شریعت کی مخالفت کرتے یا حق سے روگردانی کے مرتکب ٹھہرتے۔

● یہ امر بھی معتزلہ کے بنیادی اصولوں میں سے ایک تھا کہ وہ اپنے عقائد ونظریات پر استدلال میں عقل پر کلی اعتماد کرتے تھے۔ اثباتِ عقائد اور حقائق اشیاء کی معرفت میں عقل پر اعتماد کرنے ہی کی بنا پر یہ لوگ اشیاء کے حسن وقبح کا دارومدار عقل کو قرار دیتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ:

☜ فرماتا ہے شر کا نہیں۔ حالانکہ اہل سنت نے ارادہ کونیہ اور ارادہ شرعیہ کی تقسیم سے اس مسئلے کی خوب وضاحت کر دی ہے کہ کائنات میں ہر شے خدا تعالیٰ کی مشیت کے تحت ہے' اس میں کفر وشر بھی شامل ہے۔ یہ ارادہ کونیہ ہے۔ اور خدا کا اپنے بندوں سے جو مطالبہ ہے' یعنی اطاعت وفرمانبرداری' وہ ارادہ شرعیہ ہے۔ لیکن معتزلی اس فرق کو نہ سمجھ سکے اور غلطی کا شکار ہو گئے۔ اسی طرح یہ مسئلہ بھی اسی اصول سے نکالا کہ خدا بندوں کے افعال کا خالق نہیں بلکہ انسان خود ہی اپنے افعال تخلیق کرتے ہیں۔ حسن وقبح کا مدار عقل کو سمجھنا بھی اسی بنا پر ہے۔ نیز یہ کہ اللہ تعالیٰ پر اصلح شے کا خیال رکھنا واجب ہے۔ اس ساری تگ ودَو کا اصل مقصود یہ تھا کہ معتزلہ ایک اور باطل فرقے جہمیہ کی تردید کرنا چاہتے تھے' جن کا موقف یہ تھا کہ انسان تقدیر کا پابند ہے' لہٰذا معتزلہ نے اصولِ عدل سے تقدیر ہی کی نفی کر دی۔

(٦) معتزلہ اس نظریے کے حامل تھے کہ نیکی کرنے والے کو ثواب دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ولازم ہے اور (اس بنا پر) ثواب عطا کرنے پر وہ مستحق مدح وثنا بھی نہیں' کیونکہ اس نے اپنا ایک فرض ادا کیا ہے' کسی پر احسان نہیں کیا۔ اسی لیے وہ آیت قرآنی ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْآخِرَةِ.....﴾ کی تاویل کرتے ہیں کہ یہ تو مؤمنوں کی خوشی کی بنا پر ہوگی' ان پر لازم نہیں۔ اسی طرح معتزلہ کے نزدیک خدا تعالیٰ خطا کار کو عذاب وسزا دینے کا بھی پابند ہے' بصورتِ دیگر میعاد کی خلاف ورزی لازم آئے گی۔ لیکن اہل سنت کے مطابق خدا چاہے تو شرک کے سوا ہر گناہ معاف فرما دے' اور یہ اس کا احسان وکرم ہوگا۔

المعارف کلها معقولة بالفعل، واجبة بنظر العقل، وشکر المنعم واجب قبل ورود السمع ای قبل ارسال الرسل، والحسن والقبح صفتان ذاتیتان للحسن والقبیح

(الملل والنحل ازعبد الکریم الشهرستانی)

''تمام معارف عقل سے سمجھے جا سکتے ہیں، ان کا بجالانا عقل کی رو سے واجب ولازم ہے اور شریعت یا انبیاء کرام کے آنے سے قبل ہی محسن کا شکر واجب تھا۔ نیز حسن وقبح حسین اور قبیح اشیاء کے ذاتی اوصاف کی حیثیت رکھتے ہیں''۔

.....عقل پر بھروسہ کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ معتزلہ صفاتِ باری تعالیٰ کی ایسی تاً ویلیں کرتے ہیں جو اُن کی مریض عقلوں کے موافق ہوتی ہیں۔ مثلاً استواء، ید (ہاتھ)، عین (آنکھ) وغیرہ کی صفات۔ اسی طرح محبت، رضا، غضب اور سُخط (ناراضی) جیسی صفات کی بھی تاً ویلیں کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ معتزلہ اللہ تعالیٰ کی کوئی ایک صفت بھی تسلیم نہیں کرتے، تمام صفاتِ الٰہیہ کے انکاری ہیں۔

.....عقل پر حد سے زیادہ اعتماد ہی کا شاخسانہ ہے کہ معتزلہ کے اکابر نے کبار صحابہ کرامؓ پر طعن کیا، ان کے بارے میں زبان درازی کی اور ان پر جھوٹ کی تہمت لگائی۔ واصل بن عطا کا موقف تھا کہ جنگ جمل کے دو فریقوں میں سے ایک فاسق ہے، خواہ وہ سیدنا علی بن ابی طالب، سیدنا عمار بن یاسر، سیدنا حسن، سیدنا حسین اور سیدنا ابوایوب انصاری j کا گروہ ہو یا اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ اور سیدنا زبیر i کا لشکر۔ معتزلہ ان صحابہ کرام j کی گواہی کو رد کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ان کی شہادت قابل قبول نہیں۔ (۷)

.....خود معتزلہ میں باہمی نزاع واختلاف اور متعدد فرقوں کے ظہور کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ انہوں نے اپنی عقل پر اندھا دھند اعتماد کیا، کتاب وسنت کی صحیح اور صریح نصوص سے روگردانی کی اور بلا بحث و تمحیص اتباع شریعت کی روش اپنانے سے گریز کیا۔ اس سلسلے میں ان کا اصول یہ ہے کہ:

کل مکلف مطالب بما یؤدیه الیه اجتهاده فی اصول الدین

''اصولِ دین میں ایک مکلّف کا اجتہاد اسے جس نتیجے تک پہنچاتا ہے، اس سے وہی مطلوب ہے''۔

لہٰذا معتزلہ کے مذہب کے مطابق یہ رویہ بالکل درست ہے کہ ایک شاگرد اپنے استاد سے اختلاف کر کے اپنا نیا فرقہ بنا ڈالے۔ ابھی اوپر جن فرقوں کا ذکر ہوا وہ اساتذہ اور تلامذہ کے مابین اختلافات ہی کا نتیجہ ہیں۔ ابوالہذیل العلاف کا اپنا فرقہ تھا، اس کے شاگرد نظام نے اس کی مخالفت کی اور ایک نیا فرقہ وجود میں آ گیا۔ نظام کے شاگرد جاحظ نے اپنے استاذ سے مختلف رائے اختیار کی اور یوں ایک اور فرقہ ظہور پذیر ہوا۔ اسی طرح الجبائی کا اپنا مستقل فرقہ تھا لیکن اس کے بیٹے ابوہاشم عبدالسلام کا باپ سے اختلاف ہوا

(۷) واصل بن عطا کہتا تھا کہ سیدنا علی اور سیدنا طلحہ (i) اگر اکیلے اکیلے گواہی دیں تو وہ مسترد ہے، البتہ کسی کے ساتھ مل کر دیں تو وہ مقبول ہے۔ (الفرق بین الفرق)

تو اس کے نام پر ایک جدید فرقے نے جنم لے لیا۔ (۸)

..... معتزلہ کے افکار و نظریات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے دین کو عقلی قضیوں اور منطقی دلیلوں کے مجموعے میں ڈھال رکھا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ عمومی طور پر یونانی فلسفے اور بطور خاص ارسطو کی منطق صوری (formal logic) سے متأثر تھے۔

۞ فکرِ اعتزال پر اہلِ علم کی تنقید

علمائے اسلام معتزلہ کے زمانے ہی میں ان کے افکار و آراء کی تغلیط و تردید کے لیے میدان میں اترے۔ ان میں نمایاں نام امام ابوالحسن اشعریؒ کا ہے۔ اشعریؒ پہلے خود معتزلی تھے۔ بعد ازاں ان سے الگ ہو گئے اور بحث و مناظرہ میں انہی کے اسلوب و منہج پر ان کا ردّ کیا۔

.....اس باب میں امام اہل سنت احمد بن محمد بن حنبل الشیبانی m کا کردار بھی نا قابل فراموش ہے۔ آپ کو فتنہ خلق قرآن کے سلسلہ میں بے شمار مصائب و مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن آپ نے بے نظیر جرأت و شجاعت اور پامردی و استقامت سے اس فتنے کا مقابلہ کیا۔

..... شیخ الاسلام ابن تیمیہ m نے بھی اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''**درء تعارض العقل و النقل**'' میں قوی دلائل اور بہترین اسلوب میں ان کا رد کیا ہے۔ شیخ الاسلام ایک ایک کر کے ان کے عقائد و نظریات بیان کرتے ہیں اور پھر مسکت دلائل سے ان کی تردید فرماتے ہیں۔ علامہ ابن تیمیہؒ نے واضح کیا ہے کہ عقلِ صریح کسی طور بھی نقل صحیح کی مخالفت نہیں کرتی۔

☆ اسلام میں عقل کا مقام' ایک غلط فہمی کا ازالہ

سطور بالا میں اس امر کا کئی دفعہ تذکرہ ہوا ہے کہ معتزلہ نے نصوصِ وحی کے افہام و تفہیم میں عقل پر اعتماد کیا جس کی بنا پر وہ جادۂ مستقیم سے ہٹ گئے۔ اس سے کسی کو یہ مغالطہ لاحق ہو سکتا ہے کہ شاید اسلام عقل کا مخالف اور اس پر ناروا پابندیاں لگانے کا خواہاں ہے۔

لیکن اسلامی تعلیمات سے اس بات کی تردید ہوتی ہے کیونکہ اسلام لوگوں کو زمین و آسمان کی تخلیق میں غور و فکر کی دعوت دیتا ہے اور خیر و شر کی دریافت و جستجو میں کامل توجہ سے عقل کے استعمال پر ابھارتا ہے۔

---

(۸) یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ استاذ یا شیخ سے شاگرد کا علمی اختلاف کوئی مذموم شے نہیں۔ اہل سنت میں بہت سے معاملات میں فکر و نظر کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ صاحبینؒ نے دو تہائی مسائل میں امام اعظم ابوحنیفہؒ سے مختلف رائے اختیار کی۔ قابل مذمت طرزِ عمل یہ ہے کہ علم و تحقیق کے اختلاف کو افتراق و انتشار کی بنیاد بنا کر نت نئے فرقے بنا لیے جائیں' جیسا کہ معتزلہ اور دیگر قدیم و جدید بدعتی گروہوں کا طریق کار ہے۔

تدبر وتفکر کے باب میں بہت سی شرعی نصوص معروف ومشہور ہیں۔ چنانچہ جناب العقاد m نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے: **التفکیر فریضة اسلامیة** یعنی غور وفکر اور بحث ونظر اسلامی فریضہ ہے۔

☆ معتزلہ کی اصل غلطی

جب یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ گئی کہ اسلام عقل کا دشمن نہیں بلکہ اس کے استعمال کو لازم قرار دیتا ہے اور عقلی تحقیق وجستجو کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ معتزلہ کے انحراف کی نوعیت کیا ہے؟ ان کی اصل غلطی یہ ہے کہ انہوں نے عقل وہاں استعمال کی جو اس کا محل نہ تھا۔ یعنی امورِ غیبیہ میں عقلی گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے' جبکہ یہ معاملات حواسِ مخلوق کے دائرے سے ماوراء ہیں اور ان پر عقل کی رو سے کوئی حکم لگانا یا کوئی نظریہ قائم کرنا ممکن نہیں۔ معتزلہ نے بعض معین مقدمات پر اپنے کئی نظریات کی بنیاد رکھی ہے' لیکن ان کے نتائج علی الاطلاق درست نہیں' لہٰذا یہ رویہ کسی طور قابل قبول نہیں۔ مزید برآں اگر ان اسالیب میں بھی غور وفکر کیا جائے جو معتزلہ نے اپنے استنباط اور عقلی غور وفکر میں استعمال کیے تو ان کی کجی واضح ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ لوگ صفاتِ باری تعالیٰ کی نفی کرتے تھے اور اس باب میں ان کا استدلال خدا تعالیٰ کے اس فرمان سے تھا:

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ﴾(الشوریٰ:۱۱)

''اس جیسی کوئی چیز نہیں۔''

اب صحیح بات تو یہ ہے کہ ان صفات کی نفی نہ کی جائے جو خدا تعالیٰ نے خود اپنے لیے ثابت فرمائی ہیں اور اس آیت کا درست مفہوم بھی یہی ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ مخلوق کی صفات سے مماثلت نہیں رکھتیں۔

☆ استعمال عقل کے قواعد وضوابط

اہل علم نے جولان گاہِ عقل کی تحدید کرتے ہوئے چند اصول متعین کیے ہیں' جنہیں ملحوظ رکھنا اس باب میں ناگزیر ہے:

(۱) عقل کا نصوصِ صحیحہ سے تعارض نہ ہو۔

(۲) غیبی معاملات میں عقل استعمال نہ کی جائے کہ ان میں وحی ربانی ہی درست اور واحد قابل اعتبار مصدر ہے۔

(۳) جن امور کی حکمت واضح نہ ہو' ان میں نقل (شریعت) کو عقل پر مقدم رکھا جائے۔ یہ توقیفی امور کہلاتے ہیں۔

یہ امر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اسلام عقل کا احترام کرتا اور اسے غور وفکر کی ترغیب دلاتا ہے' لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسے شریعت مطہرہ کی صحیح نصوص پر مقدم کرنا شروع کر دیا جائے' بطور خاص اس

صورت میں کہ عقولِ انسانی باہم متغیر ومختلف ہیں اور بے شمار عوامل سے متاثر ہوتی رہتی ہیں۔ اس بنا پر عقل انسانی یہ صلاحیت نہیں رکھتی کہ وہ تمام امورِ کائنات میں صحیح اور درست فیصلہ کر سکے یا کسی ٹھوس نتیجے تک پہنچ سکے۔

☆ معرفتِ حقائق کا مصدر و ماخذ

یہ امر معلوم ومعروف ہے کہ فکر اسلامی میں حقائق اشیاء کی معرفت کا منبع و ماخذ عناصرِ ذیل پر مشتمل ہے:

(۱) حواس اور موجودات میں سے وہ امور محسوسہ جو اس کے دائرے میں آتے ہیں۔

(۲) عقل اور وہ امور جو اس تک حواس کے ذریعے پہنچتے ہیں، یعنی ایسی معلومات جو مشاہدے میں آ سکتی ہیں۔ اسی طرح (معاشرے میں پائے جانے والے) وہ عقلی معاملات (جو فرد و معاشرے پر اثر انداز ہوتے ہیں) جن کی بنیاد ثقافت و معاشرہ پر ہوتی ہے۔

(۳) کتاب وسنت کی وحی کہ غیبی امور کے باب میں یہی واحد مصدر ہے جس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ حواس کے دائرے سے خارج امور اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے آخرت میں تیار کر رکھا ہے، ان کا علم بھی محض وحی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ نیز سلسلہ نبوت و رسالت کی حقیقی اساس وحیٔ الٰہی ہی ہے۔

امور بالا سے یہ نتیجہ بآسانی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شرعی نصوص کی تفہیم و تبیین میں عقل و نقل میں ہم آہنگی پیدا کرنا ضروری ہے، تنہا عقل پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

☆ اساساتِ فکرِ اعتزال

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ صفاتِ الٰہیہ کی نفی کے معتزلی عقیدے کے ڈانڈے یہودی فلسفے کے اصول سے جا ملتے ہیں، کیونکہ جعد بن درہم نے یہ اندازِ فکر ابان بن سمعان سے لیا تھا، جس کا ماخذ طالوت تھا اور طالوت اپنے ماموں لبید بن اعصم یہودی کا شاگرد تھا۔ گویا اس عقیدے کی بنیاد یہودی افکار ونظریات پر ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ جہم بن صفوان فرقہ سمنیہ سے بحث و جدل میں مصروف رہتا تھا۔ یہ ایک ہندی فرقہ تھا جو تناسخ کے نظریے کا قائل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس فرقے سے اپنی مناظرانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں جہم دین و مذہب میں تشکیک کا شکار ہو گیا تھا لہٰذا اس نے نفیٔ صفات کا بدعتی تصور ایجاد کیا اور اسی کی تبلیغ واشاعت کرنے لگا۔

یوحنا الدمشقی کے اقوال وافکار بھی معتزلی عقائد کا ایک اہم منبع ومصدر سمجھے جاتے ہیں، کیونکہ یہ شخص اصلح، صفاتِ ازلیہ کی نفی اور حریت ارادۂ انسانی جیسے نظریات کا قائل تھا۔

تقدیر کے انکار کا عقیدہ معتزلہ کے ہاں معبد الجہنی اور غیلان الدمشقی کے ذریعے آیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں نے یہ اعتقاد ایک عیسائی ابو یونس سنسویہ[۹] سے لیا تھا۔ اور بانیٔ فکر اعتزال واصل بن عطا کے ساتھی عمرو بن عبید نے نفیٔ قدر کا تصور معبد الجہنی سے اخذ کیا تھا۔(الفرق بین الفرق:ص ۱۵)

ذات وصفات کے باب میں معتزلہ فلاسفۂ یونان سے بھی متأثر تھے۔اس سلسلے میں ایک یونانی فلسفی انبادقلیس کا قول ہے کہ:

''خدا تعالیٰ ہمیشہ ہی سے محبوب ومطلوب ہے۔ وہ علم محض اور ارادۂ محض ہے۔ وہی سخاوت وعزت ہے اور وہی قدرت وعدل' خیر اور حق ہے' لیکن کوئی ایسی طاقتیں نہ تھیں جنہیں یہ نام دیے جاتے' بلکہ یہی نام وہ (خدا) ہیں اور وہ (خدا) یہی نام ہیں''۔(الملل والنحل' ج ۲' ص ۵۸)

اسی طرح ارسطو نے اپنی بعض کتابوں میں کہا ہے کہ:

"ان الباری علم کله' قدرة کله' حیاة کله' بصر کله

''خدا تعالیٰ سارے کا سارا علم ہے' تمام کا تمام قدرت ہے' سراسر زندگی ہے' پورے کا پورا بصارت ہے''۔

معتزلی شیخ علاف نے ان فلاسفہ کے یہی افکار اپنا لیے۔اس کا کہنا تھا کہ:

ان الله عالم بعلم وعلمه ذاته قادر بقدرة وقدرته ذاته' حی بحیاة وحیاته ذاته

''اللہ تعالیٰ عالم ہے علم کے ساتھ' اور اس کی ذات ہی اس کا علم ہے۔ وہ قدرت کے ساتھ قادر ہے اور اس کی ذات ہی اس کی قدرت ہے۔ وہ زندہ ہے زندگی کے ساتھ اور اس کی ذات ہی اس کی زندگی ہے''۔

نظام معتزلی نے ''جزء لا یتجزی'' کے ابطال کا اپنا قول ملحد فلسفیوں سے لیا (یعنی کوئی جز ایسا نہیں ہے جس کا جز و نہ ہو سکے) اور پھر اس پر اپنے تصور ''طُفرہ'' (اچھلنا' کودنا) کی بنیاد رکھی۔اس کے نظریے کے مطابق یہ ممکن ہے کہ ایک جسم مقام ''الف'' سے مقامِ ''ج'' تک پہنچ جائے بغیر اس کے کہ اسے مقام ''ب'' سے گزرنا پڑے۔ یہ انتہائی عجیب بات ہے' بلکہ کہا گیا ہے کہ:

ان من عجائب الدنیا : طفرة النظام وکسب الاشعری

''نظام کا تصور طفرہ اور علامہ اشعری کا نظریہ کسب دنیا کے عجائب میں سے ہیں''۔

احمد بن ضابط اور فضل الحدثی نظام کے شاگرد ہیں۔انہوں نے کتب فلاسفہ کا مطالعہ کیا اور فلسفیانہ افکار کو عیسائی اور ہندی تصورات میں ملا جلا کر ایک ملغوبہ تیار کیا۔ یہ دونوں درج ذیل نظریات کے حامل تھے:

(۱) سیدنا مسیح d ہی آخرت میں مخلوق کا محاسبہ کریں گے۔

(۲) حضرت مسیح d نے جسم وبدن کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور آپؑ ہی کلمہ قدیمہ تھے جو جسم اور ڈھانچے کی

---

(۹) ابو یونس عراقی تھا۔اس نے عیسائیت چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا لیکن پھر دوبارہ عیسائی ہو گیا تھا۔

صورت میں ظہور پذیر ہوا تھا۔

(۳) تناسخ یعنی آواگون کا عقیدہ برحق ہے۔

(۴) رؤیت باری تعالیٰ کے سلسلہ میں وارد احادیث کو یہ عقل اول کی رؤیت پر محمول کرتے تھے۔ ان کے بقول عقل اول ہی اولین ایجاد کنندہ ہے۔ یہی عقل فعال ہے جس سے جملہ موجوداتِ عالم کو اشکال اور صورتیں عطا ہوتی ہیں۔

● علماء اسلام کی نگاہ میں یہ امر یقینی ہے کہ فکر اعتزال پر یونانی فلسفے کا گہرا اثر ہے۔ اس سلسلے میں جاحظ کی مساعی نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ یہ شخص معتزلہ کے اربابِ قلم اور اصحاب علم و ہنر میں ممتاز مقام رکھتا تھا۔ اس نے فلاسفہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا اور انہی کا مسلک و مذہب اختیار کر لیا۔ اس نے ان کے بہت سے نظریات اپنی ادبی تحریروں اور بلیغانہ اسلوب میں سمو کر لوگوں میں رائج کر دیے۔

بعض اہل علم کی رائے میں فکر اعتزال نے ان عقائد و نظریات سے جنم لیا ہے جو سرزمین عراق میں پائے جاتے تھے' کیونکہ معتزلی فرقے نے یہیں بال و پر نکالے تھے۔ عراق بہت سے فرقوں کی آماجگاہ تھا اور ان کی جڑیں مختلف گروہوں سے جا ملتی تھیں۔ چنانچہ بعض کے ڈانڈے کلدان سے' بعض کے فارس' بعض کے یہود و نصاریٰ سے اور بعض کے مجوس سے جا ملتے تھے۔ یہ لوگ جب مشرف باسلام ہوئے تو ان میں بعض لوگوں نے اسلام کو اپنی پرانی معلومات اور اپنے قدیم دینی و ثقافتی پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین میں کئی بدعات نے جنم لیا' نئے نئے عقائد و نظریات گھڑ لیے گئے اور جدید فرقے بنتے چلے گئے۔

۞ جدید فکرِ اعتزال

مرورِ زمانہ سے معتزلہ کے عقائد و نظریات امر واقعہ میں محض کتابوں کے اَوراق میں دفن ہو کر رہ گئے ہیں' لیکن عصر حاضر کے بعض قلم کار اور دانشور از سر نو معتزلی فکر کا احیاء چاہتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اسے نئے لبادے میں پیش کرنے کی سعی کی ہے اور اسے نئے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ مثلاً معقولیت پسندی' روشن خیالی' تجدید و اجتہاد' آزادیٔ فکر' تشکیل جدید' مقتضیاتِ زمانہ' روشن خیال مذہبی تصور' اسلامی اعتدال پسندی' عصری تقاضے وغیرہ۔ ان خوشنما عنوانات اور لیبلز کی آڑ میں یہ لوگ دراصل اعتزالی طرزِ فکر و عمل ہی کو رائج کرنا چاہتے ہیں۔

تعقل پسندی اور مادیت پرستی پر مبنی فکر مغرب سے مرعوبیت نے اس رجحان کو زیادہ قوی اور مضبوط کر دیا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ نام نہاد عقل انسانی کے مطابق اسلامی شریعت کی تشریح و توضیح کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جس کے نتیجے میں انہیں نصوص کی تاویل کرنا پڑتی ہے' جیسا کہ اس سے قبل معتزلہ نے کی۔ اس

مقصد کے لیے یہ مصادرِ فکر اسلامی سے بڑی باریک بینی سے ایسے ''دلائل'' تلاش کرتے ہیں جن سے ان کے افکار وتصورات کی تائید وتوثیق ہو سکے!! اب قرآن وسنت اور سلف صالحین کے لٹریچر میں تو ان کو اپنا مفید مطلب مواد ملنے سے رہا۔ البتہ معتزلہ کی آراء وافکار اور طرزِ فکر ونظر سے ان کی مطلب برآری ہوتی ہے' لہٰذا یہ انہیں اپنا منبع وماخذ بناتے اور اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔ انہی کی پیروی میں ان جدت پسندوں نے مادی معجزات کا انکار کیا ہے۔ تفسیر سورۂ فیل میں مرحوم شیخ محمد عبدہ مصری کا یہ موقف بھی اسی قبیل سے ہے کہ اصحابِ فیل کی ہلاکت پرندوں کی سنگ باری کے بجائے مرضِ خسرہ یا چیچک کی وبا سے ہوئی!!

● فکر اعتزال سے متأثر جدید مفکروں کی نگاہ میں معتزلہ کا یہ بنیادی اصول انتہائی اہم ہے کہ عقل ہی حقیقت تک رسائی کا واحد ذریعہ ہے خواہ وہ حقیقت حواس کے دائرے سے باہر ہی کیوں نہ ہو۔ گویا انہوں نے ہر عقیدے اور فکر کو عقلِ کوتاہ کے تابع کر دیا ہے۔

اس معتزلی فکر کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس کے حاملین' کتاب وسنت کی محکم نصوص سے ثابت شدہ احکام میں بھی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ مثلاً مرتد کی سزا' فرضیت جہاد' حدود وقوانین وغیرہ۔ ان کا مطالبہ ہے کہ ان سب پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان میں عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ترامیم کی جائیں۔ جب ان دوٹوک' صریح اور بالکل واضح اصولی معاملات میں ان لوگوں کی رائے یہ ہے تو پھر حجاب' تعددِ ازدواج اور طلاق ووراثت جیسے مسائل بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کو تو یہ درخور اعتنا ہی نہیں سمجھتے' بلکہ علاقائی رسم ورواج اور مقامی ثقافت قرار دے کر سرے سے دائرۂ شریعت ہی سے خارج کر دیتے ہیں۔

☆ جدید معتزلی مفکرین اور دانشور

جدید فکر اعتزال کے داعیوں میں ایک نمایاں نام سعد زغلول کا ہے' جس نے مصری عورت سے حجاب اتارنے کا مطالبہ کیا۔ قاسم امین بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''**تحریر المرأة**'' (آزادیٔ نسواں) اور ''**المرأة الجديدة**'' (خاتونِ جدید) بہت مشہور ہیں۔ اسی طرح لطفی السید [جنہیں استاذ الجیل (ایک نسل کا استاد) کا لقب دیا گیا] اور طٰہٰ حسین بھی اس حوالے سے کافی معروف ہیں۔ ان کو ''**عميد الادب العربی**'' (ادب عربی کی سربرآوردہ شخصیت) کا خطاب دیا گیا ہے۔ یہ تمام لوگ اگلی دنیا کو سدھار چکے ہیں۔ ان سب کا تعلق عرب دنیا سے تھا۔

● برصغیر پاک وہند میں منہج اعتزال کے اوّلین سرخیل سید احمد خاں تھے جنہیں برطانوی سامراج کی جانب سے ''سر'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ سرسید کی رائے تھی کہ صرف اور صرف قرآن کریم ہی شریعت اسلامی کی اساس ہے' یعنی وہ سنت نبویؐ کی تشریعی حیثیت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔ وہ تجارتی معاملات میں معمولی سود کو جائز قرار دیتے تھے۔ سرسید رجم اور حرابہ کی شرعی سزا کے بھی منکر تھے۔ وہ دین کی نشر واشاعت کے لیے جہاد وقتال کے قائل نہ تھے بلکہ اسے ممنوع سمجھتے تھے۔ یہ دراصل انگریز کو خوش کرنے کی

ایک کوشش تھی' کیونکہ مسلمانانِ ہند کے جہاد سے برطانوی استعمار کو بہت نقصان اٹھانا پڑا تھا۔

سرسید کے شاگرد سید امیر علی بھی یہی نظریات رکھتے تھے۔ انہوں نے مسلمان خاتون کی عیسائی یا یہودی مرد سے شادی کو جائز قرار دے دیا تھا' نیز وہ اختلاطِ مرد وزَن کے بھی قائل تھے۔ (۱۰)

☆ سیکولر مفکرین

وہ سیکولر اور بے دین قسم کے مفکر اور دانشور بھی اسی زمرے میں آتے ہیں جن کا اسلام سے برائے نام ہی تعلق ہوتا ہے۔ مثلاً ان میں ایک اہم شخصیت زکی نجیب محمود کی ہے۔ ان صاحب نے ''**الوضعية المنطقية**'' کا نظریہ پیش کیا جو کہ جدید فلسفہ وضعیہ (۱۱) ہی کی ایک شاخ ہے۔ اس کے ماننے والے ہر غیبی معاملے کا انکار کرتے ہیں۔ زکی نجیب کے مطابق اعتزالی فکر و فلسفہ ہمارے ورثے کا ایک حصہ ہے جسے زندہ کرنا ہم پر لازم ہے اور لوگوں کو چاہیے کہ وہ موجودہ زمانے میں درپیش مسائل و مشکلات کے مقابلے میں معتزلہ جیسے کردار اور رویے کا مظاہرہ کریں۔ (تجدید الفکر العربی' ص ۱۲۳)

انہی میں احمد امین بھی شامل ہیں۔ یہ '**فجر الاسلام**' '**ضحی الاسلام**' اور '**ظهر الاسلام**' جیسی تاریخی و ادبی کتابوں کے مؤلف ہیں۔ احمد امین قدیم زمانے میں معتزلہ کے مٹ جانے کا ماتم کرتے ہیں۔ گویا ان کا باقی رہنا اسلام کے لیے انتہائی مفید اور ضروری تھا!! اپنی کتاب ''**ضحی الاسلام**'' میں لکھتے ہیں:

> **في رأي ان من اكبر مصائب المسلمين موت المعتزلة** (ج ۳' ص ۲۰۷)
>
> ''میری رائے میں معتزلہ کی موت مسلمانوں کی سب سے بڑی مصیبت و بدنصیبی ہے''۔

---

(۱۰) یہ مضمون چونکہ ایک عربی تحریر سے ماخوذ ہے اس لیے اس میں زیادہ تر خطۂ عرب ہی کے منحرفین کا تذکرہ کیا گیا ہے اور برصغیر سے صرف دو افراد کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن یہاں ایسے افراد اور اداروں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے جو سرکاری اور نجی سطح پر اعتزالی فکر کے علمبردار ہیں۔ اب تو کئی نئے افلاطونی بھی ابھر کر سامنے آ رہے ہیں۔ بعض لوگ قرآنی معارف کے نام پر ''اسلام کو طلوع'' کرا رہے ہیں تو کچھ ادارے اسلام کی ''نظریاتی'' اور ''ثقافتی'' اساس کے حوالے سے اپنے من پسند افکار و نظریات عوام میں پھیلا رہے ہیں۔ کچھ ''اربابِ دانش'' ایسے بھی ہیں جو ''نشأۃِ ثانیہ'' اور ''علم و تحقیق'' کے بلند بانگ نعروں کے ساتھ تہذیب مغرب کی ترویج و تائید میں مصروفِ عمل ہیں۔ اس کے لیے وہ قدیم دینی ادب سے شاذ اور متروک اقوال بھی بطورِ سند ڈھونڈ لاتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ معتزلہ قدیم ہوں یا جدید اور عرب سے تعلق رکھتے ہوں یا عجم سے' ان کے مقاصد اور حربے یکساں ہیں۔ گویا ﴿تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ﴾ کا بیّن مصداق ہیں۔

(۱۱) القاموس الوحید کے مطابق ''الوضعیۃ'' سے مراد ہے: ''فرانسیسی مفکر اِگسٹ کومٹ کا ایک فلسفیانہ نظریہ جو علم کا مدار تجربات و واقعات کو قرار دیتا ہے''۔ (ملاحظہ ہو' ص ۱۸۶۵)

☆ عصر حاضر میں فکر اعتزال کے علمبردار

معاصرین میں جو لوگ دعوت اسلامی کے قافلے میں شامل ہیں ان میں بھی ایسے افراد موجود ہیں جو معتزلہ کے عقلی طریق پر عقیدہ و شریعت کی تشکیل نو کا نظریہ رکھتے ہیں۔ جیسا کہ ڈاکٹر محمد فتح عثمان نے اپنی کتاب ''**الفکر الاسلامی والتطور**'' (فکر اسلامی اور تشکیل جدید) میں یہی فکر پیش کی ہے۔ (۱۲)

ڈاکٹر حسن الترابی بھی اسی زاویۂ نگاہ کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اصولِ فقہ کی تجدید کے متمنی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ہمارے موجودہ زمانے میں احکام اسلام کے نفاذ کے لیے بڑے پیمانے پر عقلی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں عقل کے کردار سے کسی صاحب خرد کو انکار نہیں ہوسکتا۔ آج ہمیں جس اجتہاد کی احتیاج ہے وہ صرف فروع ہی میں نہیں بلکہ اصول میں بھی ہوگا''۔ (دیکھئے کتاب المعتزلة بين القديم والحديث از محمد العبدة اور طارق عبدالحليم' ص ۱۳۸)

علاوہ ازیں عصر حاضر کے بہت سے اہل قلم اور مسلم دانشور اسی روش پر گامزن ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اجتہاد' اسلامی تصورات کی تشکیل نو اور احکامِ شرعیہ کی اصلاح وسدھار میں عقل کا بہت بڑا کردار ہے' حتیٰ کہ تاریخی واقعات میں بھی عقل دخیل ہے!!

ان لوگوں میں فہمی ہویدی' محمد عمارۃ (اس کا معتزلی ورثے کے احیاء اور اس کے دفاع میں بہت نمایاں رول ہے)' خالد محمد خالد اور محمد سلیم العوا وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

کارِ تجدید واجتہاد میں درست رویہ

بلاشبہ اجتہاد وتجدید وقت کی اہم ضرورت اور فکر اسلامی میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے اور شریعت کی تفہیم وتبیین میں عقل کا استعمال بھی اپنی جگہ ضروری ہے۔ لیکن یہ عملِ اجتہاد وتجدید اور استعمالِ عقل ودانش' شریعت کی ثابت شدہ نصوص کے دائرے میں ہونا چاہیے۔ نیز اس کارِ اجتہاد میں اُمت کے ذاتی اسباب اور داخلی محرکات کو بنیاد بنانا ہوگا' ایسا نہ ہو کہ غیروں کے دباؤ یا خارجی عوامل کے مدنظر نصوصِ شریعت ہی میں تغیر وتبدل شروع کر دیا جائے۔ یہ اجتہاد کی بجائے الحاد اور تنسیخ شریعت کی ناپاک جسارت کے مترادف ہوگا۔ مزید برآں اگر ایک مرتبہ طاغوتی طاقتوں کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں تو پھر ان کا سلسلہ کبھی ختم

(۱۲) عجیب ''حسنِ اتفاق'' ہے کہ پاک وہند میں بھی ایک کتاب ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے شائع ہوئی جو انڈیا میں ہونے والے ایک سیمینار میں پیش کیے گئے خطبات ومقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعض مضامین اگرچہ مثبت فکر پر مبنی ہیں لیکن بیشتر مقالات میں یہی تصور پیش کیا گیا ہے کہ روحِ عصر کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتہاد کے ذریعے اسلامی احکام میں مناسب تبدیلیاں کی جانی چاہئیں!! (یہ سیمینار دسمبر ۱۹۷۶ء میں ہوا تھا اور پاکستان میں اس کتاب کو مکتبہ رحمانیہ' لاہور نے شائع کیا ہے۔)

نہیں ہوتا' بلکہ ہر دم هَلْ مِنْ مَزِیْدٍ کی صدا آتی ہے۔ اسلام کا مطالبہ تو یہ ہے کہ تمام شعبہ ہائے زندگی کو خدا کے قانون کے مطابق ڈھالا جائے اور زمانے کے جملہ مسائل کا حل صرف اور صرف شرعی نصوص ہی سے تلاش کیا جائے۔ اس کے برعکس اگر مسلمان زندگی میں پیش آمدہ جدید مسائل اور خارجی عوامل کے زیر اثر اجتہاد کا نعرہ لگاتے ہوئے اسلام ہی کی اصلاح و ترمیم کے درپے ہو جاتے ہیں' جیسا کہ بعض لوگوں کا طریق کار ہے' تو اس کے نتیجے میں اسلام کا محض نام ہی باقی رہ جائے گا اور شریعت کتابوں کے حروف و الفاظ میں سمٹ کر رہ جائے گی اور اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو پہلی شریعتوں کا ہوا کہ ان کے ماننے والوں نے ذاتی خواہشات کی بنا پر ان میں تحریف کر ڈالی حتیٰ کہ ان کا اپنے بنیادی اصولوں سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔ (۱۳)

☆ خلاصۂ بحث

سابقہ سطور سے واضح ہوتا ہے کہ معتزلہ کی تحریک بعض مسلمان مفکرین کے ان فلسفوں سے تال میل

(۱۳) بعض لوگ تجدید کے نام پر شریعت میں تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ لیکن وہ تجدید اور تجدد میں فرق سے ناآشنا ہیں۔ اقتباسِ ذیل سے اس فرق کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے:

''زمانے کے تغیرات پر دو قسم کے ردعمل اسلامی تاریخ میں نظر آتے ہیں۔ ایک کا نام ''تجدید'' ہے اور دوسرے کا ''تجدد''۔ ''تجدید'' یہ ہے کہ زمانے کے تغیرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصل دین کو بلا کم و کاست پیش کیا جائے اور اپنے دور اور اپنے زمانے کی زبان میں محکم استدلال کے ساتھ پیش کیا جائے۔ نیز تدبر و اجتہاد کے ذریعے سے دین کو اپنے دور کے حالات پر نافذ کرنے کی عملی جدوجہد کی جائے۔ ان تمام ذرائع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے جو قدرت نے انسان کو فراہم کیے ہیں اور اسلامی بصیرت کے ساتھ نئے پیش آمدہ مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں طے کیا جائے۔ تجدید کے ذریعے سے ہر زمانے میں دین کی تعلیمات اور زندگی کے بہاؤ کے درمیان تعلق اور رابطہ گہرا ہوتا جاتا ہے اور زندگی کا دریا اسلام کی شاہراہ سے ہٹ کر چلنے نہیں پاتا۔ یہاں مخلصانہ اجتہاد کے ذریعے سے نئے مسائل اور نئی مشکلات کو حل کیا جاتا ہے اور دین اپنے رنگ پر قائم رہتا ہے۔

''تجدد'' اس کے مقابلے میں وہ کوشش ہے جو زمانے کے تقاضوں کے نام پر خود دین کو بدل ڈالنے کے لیے کی جاتی ہے۔ زندگی اور زمانے کے درمیان ربط اس طریقے سے بھی قائم ہو جاتا ہے لیکن یہ ربط اسلام کی سرزمین پر نہیں غیر اسلام کی سرزمین پر قائم ہوتا ہے۔ اس میں اسلام کو اصل قرار دے کر حالات کو اس کے مطابق ڈھالنے کے بجائے زمانے کی چلتی ہوئی تہذیب کو اصل مان کر اس کے پیدا کیے ہوئے حالات پر اسلام کو ڈھال دیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو اگر مسلمان ہر زمانے میں اختیار کرتے چلے جائیں تو اسلام کی کوئی چیز بھی اپنی جگہ پر باقی نہیں رہ سکتی' بلکہ اسلام سرے سے کسی متعین مذہب و مسلک اور نظریے و نظام کا نام ہی نہیں رہتا۔

اسلام میں تجدید کے دروازے ہمیشہ کھلے رہے ہیں اور پوری تاریخ میں اسلام کے سچے خادم یہ کارنامہ انجام دیتے ہوئے نظر آتے ہیں' لیکن تجدد کی اس میں کوئی گنجائش نہیں۔ ماضی میں جب بھی تجدد نے سر اٹھایا ہے مسلمانوں نے سختی کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ہے اور ہر ایسی تخریبی کوشش ملت کی رائے عامہ سے ٹکرا کر آخر کار ختم ہوگئی ہے''۔ (اسلامی نظریہ حیات' ص ۱۱۷' مؤلف: پروفیسر خورشید احمد)

اور تأثر پذیری کا نتیجہ تھی جو اسلامی خلافت کے زمانے میں غالب تھے اور مسلمانوں سے ملحقہ قریبی خطوں اور معاشروں میں چھائے ہوئے تھے۔ گویا یہ ایک قسم کا ردعمل تھا' جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کے عقائد و افکار کو انہی فلسفوں کے اسلوب میں ڈھال کر پیش کیا جائے تاکہ دیگر تہذیبوں اور مذہبوں کے ملحدوں کے اعتراضات واشکالات کے جواب میں اسلام کا دفاع ایسے طریقے سے کیا جائے جسے وہ سمجھ سکیں۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دفاع کرنے والے خود پھسل گئے اور اسلامی تعلیمات کی مخالفت میں بہت سی غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھے۔ جیسا کہ معتزلہ نے باری تعالیٰ کو مخلوق کی مشابہت سے پاک قرار دیتے ہوئے سرے سے صفات ہی کا انکار کر دیا۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات بھی آشکار ہو کر سامنے آتی ہے کہ معتزلہ کے جدید پیروکار بھی اسی روش پر گامزن ہیں جس پر ان کے اسلاف چلتے رہے اور یہ بھی انہی جیسی غلطیوں کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ ان کے پیش کردہ افکار و نظریات اور اجتہادات کا اصل ہدف یہ ہے کہ تہذیب مغرب کے علمبرداروں کے سامنے اسلام کو ایسی شکل میں پیش کیا جائے جو اُن کے لیے قابل قبول ہو۔ یہ اپنے تئیں اسلامی نظام کا دفاع کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اگر اسلامی تہذیب و تمدن کے نتائج تہذیب مغرب سے بہتر نہیں تو کم بھی نہیں!![۱۴]

درست رویہ یہ ہے کہ بعد میں آنے والے اپنے پیشروؤں کی لغزشوں سے سبق سیکھیں اور ان سے بچنے کی کوشش کریں۔ انہیں یہ معلوم ہو جانا چاہیے کہ دیگر ادیان و مذاہب پر اسلام کا غلبہ و عزت اس کے ممتاز نظام اور منفرد قانون و شریعت کی بنا پر ہے' لہٰذا اس میں غیروں کے نظریات اور فلسفوں کی پیوند کاری کی کوئی گنجائش ہے اور نہ ضرورت۔ یہ طرزِ فکر و عمل درحقیقت مرعوبانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے جس کی بنیاد غلط نگہی اور کوتاہ فکری ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کتاب وسنت پر مبنی شریعت اپنی جامعیت و اکملیت کی بنا پر ایک معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے جس پر دیگر نظریات اور فلسفے پرکھے جاتے ہیں اور اس کا صحیح فہم سلف صالحین کے نہج پر چلنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ oo

(۱۴) یہ محض کوتاہ نظری اور عقل کی کجی کا شاخسانہ ہے' ورنہ دونوں تہذیبوں کی ساخت پرداخت اور نتائج و ثمرات میں زمین آسمان کا فرق ہے' جیسا کہ کسی بھی صاحب خرد سے مخفی نہیں۔

محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کے مکمل دورۂ ترجمہ قرآن اور دروس و خطابات کے علاوہ تلاوتِ قرآن' کتب احادیث کے تراجم' حکمت قرآن' میثاق اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے' اردو و انگریزی کتب' کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست ہماری ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے!

علم کے اَدَوات
اور معاون انسانی اعضاء

حافظ محمد مشتاق ربانی

اِس مضمون میں قرآن حکیم کی روشنی میں علم کے بعض بنیادی اَدوات (آلات)، جیسے قلم، دوات، روشنائی، قرطاس، لوح اور انسانی بدن کے بعض معاون اعضاء و جوارح، جیسے کان، آنکھیں، دل، ہاتھ، پاؤں اور زبان کا ذکر کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم ان کے اوپر مختصراً روشنی ڈالتے ہیں۔

(۱) القلم

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ﴾ (العلق) ''جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا۔''

اس آیت میں قلم کا ذکر ہے، جو حصولِ علم کے لیے ایک اہم معاون ہے۔ قرآن کریم میں اس کی قسم بھی کھائی گئی ہے۔ سورۃ القلم کی پہلی آیت میں فرمایا:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۙ﴾ ''ن، قسم ہے قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں (اس کی قسم)''۔

ابن منظور ''لسان العرب'' میں لکھتے ہیں:

''قلم وہ ''آلہ'' ہے جس کی مدد سے لکھا جاتا ہے۔ عربی لغت میں اس کی جمع اَقْلام اور قِلام ہے اور قرآن شریف میں اَقْلام استعمال ہوئی ہے۔ سورۂ لقمان کی آیت ۲۷ میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ.....﴾ ''اور اگر یوں ہو کہ زمین میں جتنے درخت ہیں (سب کے سب) قلم ہوں.....''

واضح رہے کہ قرآن کریم میں ''القاء الاقلام'' قرعہ اندازی کے مفہوم میں اِستعمال ہوا ہے۔ سورۂ آل عمران کی آیت ۴۴ میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ ''اور آپ اُس وقت وہاں موجود نہ تھے جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ مریم کا سرپرست

کون ہوا اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے''۔

قلم کی اہمیت اور مقام و مرتبہ کے بارے میں مولانا امین احسن اصلاحی (ت ۱۹۹۷م) ''تدبر قرآن'' میں لکھتے ہیں:

''سابق انبیاء f نے جو تعلیم دی وہ زبانی تعلیم کی شکل میں تھی، جس کو محفوظ رکھنا نہایت مشکل تھا۔ وہ بہت جلد یا تو محرف ہو کر مسخ ہو جاتی یا اس پر نسیان کا پردہ پڑ جاتا، اللہ تعالیٰ نے دین کو اِس آفت سے محفوظ رکھنے کے لیے انسان کو قلم اور تحریر کے استعمال کا طریقہ سکھایا جس سے وہ اس قابل ہوا کہ زبانی تعلیم کی جگہ تحریر کے ذریعہ سے تعلیم دی جاتی۔ چنانچہ سب سے پہلے اس کو تورات کے ''احکامِ عشرہ'' الواح میں لکھ کر دیے گئے۔ پھر دوسرے نبیوں کی تعلیمات بھی قلمبند ہوئیں اور سب کے آخر میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب اس طرح محفوظ کی گئی کہ قیامت تک اس میں کسی تحریف وتغیر کا ادنیٰ احتمال باقی نہ رہا''۔ (تدبر قرآن، ج ۴، ص ۵۱۳)

یہاں یہ بات قابل تحقیق ہے کہ قلم کا باقاعدہ استعمال کب ہوا۔ اس بارے میں ایک حدیثِ نبویؐ بھی ہے کہ:

((اِنَّ اَوَّلَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ فَقَالَ : اُكْتُبْ، قَالَ : مَا اَكْتُبُ؟ قَالَ : اُكْتُبِ الْقَدَرَ مَا كَانَ وَمَا هُوَ كَائِنٌ اِلَى الْاَبَدِ)) (۱)

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم کو پیدا کیا اور اس سے کہا لکھ! قلم نے پوچھا کیا لکھوں؟ فرمایا: جو کچھ ہو چکا اور جو آئندہ ہوگا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ تخلیق انسانی سے قبل ہی قلم کے استعمال کا آغاز ہو چکا تھا۔

ب) نٓ

ارشادِ ربانی ہے:

﴿نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۙ﴾ (القلم)

عام طور پر مشہور ہے کہ ''نٓ'' حروفِ مقطعات میں سے ہے، لیکن ''ن'' کا ایک معنی دوات بھی ہے، جیسا کہ عبدالرحمٰن بن جوزی (ت ۵۹۷ھ) کی تفسیر ''زاد المسير فی علم التفسير'' اور امام القرطبی (ت ۶۷۱ھ) کی ''الجامع لاحكام القرآن'' میں حضرت ابو ہریرہ h سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا::

((اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللّٰهُ الْقَلَمَ، ثُمَّ خَلَقَ النُّوْنَ، وَهِيَ الدَّوَاةُ))(۲)

''سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے قلم پیدا کیا، پھر ''النون'' اور وہ دوات ہے۔''

کئی تفاسیر میں جیسے ''الجامع لاحكام القرآن'' میں حضرت ابن عباس i کا قول نقل ہے کہ ''ن'' سے مراد دوات ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کہ ''النون'' کے معنی مچھلی کے بھی ہیں۔ جیسا کہ

سورۃ الانبیاء کی آیت ۸۷ میں حضرت یونس d کو ''ذوالنون'' کہہ کر یاد کیا گیا اور سورۃ القلم کی آیت ۴۸ میں ان کا ذکر ''صاحب الحوت'' کے نام سے کیا گیا۔

ج) القِرطاس

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝﴾ (الانعام)

''(اے پیغمبر!) اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق کا انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔''

اس آیت میں لفظ ''قِرطَاس'' آیا ہے۔ امام راغب اصفہانی (ت ۵۰۲ھ) ''مفردات القرآن'' میں لکھتے ہیں کہ ''(قرطاس) ہر وہ چیز ہے جس پر لکھا جائے''۔

مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر قرآن'' میں سورۃ الانعام کی آیت ۹۱ کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''(قرطاس) صحیفہ اور ورق کو کہتے ہیں، چاہے وہ کسی چیز سے بنایا گیا ہو۔ اس سے مراد وہ تمام چیزیں ہوں گی جو اِس زمانے میں لکھنے کے کام آتی تھیں''۔

اس کی جمع قراطیس ہے جو قرآن مجید میں سورۃ الانعام کی آیت ۹۱ میں وارد ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا﴾

''ان سے پوچھو کہ وہ کتاب کس نے نازل کی جسے موسیٰ (d) لائے تھے، جو تمام انسانوں کے لیے نور اور ہدایت تھی، جسے تم پارہ پارہ (الگ الگ ورق) کر کے رکھتے ہو، کچھ دکھاتے ہو اور بہت کچھ چھپا جاتے ہو''۔

د) مِداد

ارشادِ ربانی ہے:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝﴾ (الکھف)

''(اے نبیؐ!) کہو کہ اگر سمندر میرے ربّ کی باتیں لکھنے کے لیے روشنائی بن جائے تو وہ لازماً ختم

ہو جائے مگر میرے ربّ کی باتیں ختم نہ ہوں' بلکہ اگر اتنی ہی روشنائی ہم اور لے آئیں (تو وہ بھی کفایت نہ کرے)۔''

اس آیت میں مِدَاد کا ذکر ہے۔اس کے اور معنی بھی ہیں' جیسے چراغ کا تیل' ہر چیز کی زیادتی' لیکن یہاں ''روشنائی'' کے معنی مراد ہیں۔ مرتضٰی الزبیدی کی کتاب ''تاج العروس من جواھر القاموس'' میں ابن الانباری کا قول نقل کیا گیا ہے کہ روشنائی کو مداد اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ کاتب کی مدد کرتی ہے''۔

ضمنی طور پر یاد رکھیں کہ عربی قواعد میں اسم الآلہ کے تین اَوزان تو مشہور ہیں' یعنی مِفْعَل' مِفْعَال' مِفْعَلَة' لیکن چار اَوزان اور بھی ہیں: فعّالة' فاعلة' فاعول اور فِعال. اس آخری وزن کی مثال مِداد بھی ہے۔

آیت کے آخر میں مَدَدًا آیا ہے جس سے بقول امام راغب کے ''روشنائی'' کے معنی مراد ہیں۔ قرآن شریف میں اس سے فعل بھی استعمال ہوا ہے' جیسے سورۂ لقمان کی آیت ۲۷ میں فرمایا:

﴿وَالْبَحْرُ يَمُدُّهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ﴾

''اور سمندر (کا تمام پانی) روشنائی ہو اور سات سمندر اور (روشنائی) ہو جائیں۔''

یَمُدُّ کے معنی ''سیاہی بن جائیں'' کے ہیں' لیکن اس کے معنی ''وہ ڈھیل دیتا ہے'' کے بھی ہیں۔سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۵ میں ''یَمُدُّھُمْ'' کے معنی ''ان کو بڑھاتا ہے'' کے ہیں' بشرطیکہ یہاں ھُمْ کو منصوب علیٰ نزع الخافض قرار دیں' جیسا کہ علامہ عبدالرشید نعمانیؒ کی کتاب ''لغات القرآن'' میں ذکر ہوا ہے۔

۹) لوح

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ۝﴾ (البروج) ''(قرآن مجید) لوحِ محفوظ میں لکھا ہوا ہے۔''

اس آیت میں لفظ ''لَوْحٍ'' استعمال ہوا ہے جس کے معنی ''لکھنے کی چوڑی تختی'' کے ہیں۔لَوح کی جمع اَلواح ہے۔سورۃ الاعراف کی آیت ۱۴۵ میں فرمایا: ﴿وَكَتَبْنَا لَهٗ فِي الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ﴾ ''اور ہم نے (تورات کی) تختیوں میں ان کے لیے ہر قسم کی نصیحت اور ہر چیز کی تفصیل لکھ دی۔'' سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۰ میں فرمایا: ﴿وَاَلْقَى الْاَلْوَاحَ﴾ ''اور موسیٰ نے (جوش میں) الواح زمین پر پٹخ دیں۔'' سورۃ الاعراف آیت ۱۵۴ میں فرمایا: ﴿وَلَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ﴾ ''اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے الواح اٹھالیں۔'' قرآن حکیم میں الواح ''کشتی کے تختے'' کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔سورۃ القمر میں فرمایا: ﴿وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ۝﴾ ''اور ہم نے نوحؑ کو تختوں اور کیلوں سے تیار شدہ (کشتی) میں سوار کیا۔''

مندرجہ بالا ذرائع ووسائل وہ تھے جنہیں کسی چیز کو احاطۂ تحریر وکتابت میں لانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اب انسانی بدن کے اُن اعضاء و جوارح کا تذکرہ کیا جاتا ہے جو علم حاصل کرنے کے معاون ہوتے ہیں۔

(ا) اَلْاُذَان

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''اور اُن کے کان ہیں مگر اُن سے سنتے نہیں''۔

یہاں اٰذَانٌ کا ذکر ہے جس کا واحد اُذُنٌ ہے۔ اس کے معنی ''کان'' کے ہیں۔ یہ مؤنث ہے' کیونکہ انسانی بدن کے وہ اعضاء جو جوڑے کی شکل میں ہوں وہ مؤنث ہوتے ہیں' خواہ ان کے آخر میں ''ۃ'' ہو یا نہ ہو' لیکن چند اسماء مستثنیٰ ہیں' جیسے صدغ (کنپٹی)' مِرْفَقٌ (کہنی)' حاجب (ابرو) اور خد (رخسار) ہیں۔ کان حصولِ علم کا ایک اہم انسانی عضو ہے۔ اسی لیے سورۃ الاعراف میں فرمایا:

﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ﴾

''اور جب قرآن شریف پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے''۔

قرآن شریف میں قوتِ سامعہ کے لیے ''اَلسَّمْعُ'' بھی استعمال ہوا ہے۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۷ میں فرمایا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ﴾ ''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا رکھی ہے''۔ اور ''اَلسَّمْعُ'' سَمِعَ يَسْمَعُ سے مصدر کے طور پر قرآن شریف میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ الشعراء میں فرمایا: ﴿اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ﴾ ''وہ تو سننے سے برطرف کر دیے گئے ہیں''۔

آپ کے ذہن میں سوال پیدا ہوا ہوگا کہ سورۃ البقرۃ میں ''سَمْع'' (واحد) کیوں استعمال ہوا ہے' اَسْمَاع (جمع) کیوں نہیں آیا' جبکہ اس سے پہلے قُلُوب اور اس کے بعد اَبْصَار جمع آئے ہیں؟ اس کا جواب مولانا امین احسن اصلاحی ''تدبر قرآن'' میں لکھتے ہیں:

> ''اس چیز کا تعلق اہل زبان کے طریق استعمال سے ہے۔ قرآن شریف میں یہ لفظ کم وبیش ۲۰۔۲۲ مقامات پر استعمال ہوا ہے اور اکثر جگہ قُلُوب' اَفْئِدَة اور اَبْصَار کے ساتھ استعمال ہوا ہے' لیکن ہر جگہ سمع واحد ہی کی شکل میں استعمال ہوا ہے' کہیں بھی جمع کی شکل میں استعمال نہیں ہوا۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید زبان کے لحاظ سے بھی ایک معیاری چیز ہے' اس وجہ سے ماننا پڑے گا کہ فصحاء اس سباق میں اس لفظ کو اسی طرح استعمال کرتے رہے ہیں''۔ (تدبر قرآن' ج ۱' ص ۱۱۰)

ب) اَلْاَعْیُن

ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''اور اُن کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں۔''

اس کا واحد عَیْنٌ ہے۔ جمع اَعْیَان بھی آتی ہے اور عُیُوْن بھی۔ ''عین'' ایک عضو ہے' جو دیکھنے کے لیے ہے۔ آنکھوں کے لیے ابصار بھی قرآن کریم میں آیا ہے' جس کا واحد بصر ہے۔ سورۃ النجم کی آیت ۱۷ میں فرمایا: ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ ''ان کی آنکھ نہ تو اور طرف مائل ہوئی اور نہ آگے بڑھی''۔

ج) اَلْفُؤَاد

ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (الاسراء)

''بے شک کان' آنکھ اور دل سب (کے اعمال وافعال) کی باز پرس ہوگی۔''

اس آیت میں ''اَلْفُؤَاد'' (دل) کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اس کی جمع اَفْئِدَةٌ ہے جو قرآن شریف میں کئی مقامات پر وارد ہوا ہے۔ امام رازی نے اپنی تفسیر ''التفسیر الکبیر ومفاتیح الغیب'' میں اَفْئِدَةٌ کا مفہوم ''عقول'' لیا ہے۔

غلام احمد پرویز سے لغات القرآن اور اس کی دیگر کتب سے نظری اختلاف ہونے کے باوجود الفؤاد کے بارے میں ان کی رائے نقل کی جارہی ہے' جو انہوں نے لغات القرآن میں بیان کی ہے:

> ''جب انسانی جذبات کی طرف اشارہ ہوگا تو فؤاد آئے گا اور جب انسانی فکر کے متعلق بات ہوگی تو قلب آئے گا۔ ان دونوں کی یہ تقسیم عمومی ہے' ورنہ ان دونوں کا استعمال دل کے معنی میں ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں سیاق وسباق کی رو سے دیکھنا چاہیے کہ کس مقام پر عقل وفکر مراد ہے اور کس مقام پر جذبات' اس فرق کی رو سے قلب اور فؤاد کے معنی کرنے چاہئیں۔ ہمارے ہاں کے لفظ ''دل'' کے معاملہ میں انگریزی کا لفظ mind زیادہ جامع ہے۔ مذکورہ بالا آیت میں فؤاد سے مراد mind ہے یا جذبات۔ mind اس لیے کہ حواس کے ذریعے جو اطلاعات بہم پہنچتی ہیں وہ ان سے نتیجہ نکالتا ہے' اور جذبات اس لیے کہ اگر ان اطلاعات کو جذبات متأثر کر دیں تو انسان کبھی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتا''۔

''المعجم الوسیط'' جو عربی کی لغت ہے' اس میں لکھا ہے کہ ''ھو فارغ الفؤاد'' اس شخص کے

لیے بولا جاتا ہے جسے کوئی اندیشہ اور غم نہ ہو یا جو برے حال میں ہو۔ سورۃ القصص کی آیت ۱۰ میں حضرت موسیٰ d کی والدہ کے بارے میں آیا ہے: ﴿وَاَصۡبَحَ فُؤَادُ اُمِّ مُوۡسٰی فٰرِغًا ؕ﴾ ''اُدھر موسیٰ کی والدہ کا دل اڑا جارہا تھا۔''

قُلُوۡب اور اَفۡئِدَۃ کے ساتھ ایک اور لفظ ''صُدُوۡر'' ہے۔ انسان کا دل ''صدر'' (سینہ) میں ہی ہوتا ہے۔ یہ بات امام رازی (ت۶۰۴ھ) نے اپنی تفسیر ''التفسير الكبير ومفاتيح الغيب'' میں سورۃ الحج کی اس آیت کی روشنی میں کہی ہے: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَی الۡاَبۡصَارُ وَلٰكِنۡ تَعۡمَی الۡقُلُوۡبُ الَّتِیۡ فِی الصُّدُوۡرِ ♦﴾ ''بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں' بلکہ دل جو سینوں میں ہیں (وہ) اندھے ہوجاتے ہیں۔''

بہرحال قرآن کریم میں کئی مقامات ہیں جہاں صدور سے قلوب مراد لیے جا سکتے ہیں۔ جیسے سورۃ آلِ عمران کی آیت ۲۹ میں فرمایا: ﴿قُلۡ اِنۡ تُخۡفُوۡا مَا فِیۡ صُدُوۡرِكُمۡ اَوۡ تُبۡدُوۡهُ يَعۡلَمۡهُ اللّٰهُ ؕ﴾ ''(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ کوئی بات تم اپنے دلوں میں مخفی رکھو یا اسے ظاہر کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔''

اس آیت میں ''صدور'' سے ''قلوب'' مراد لیے جا سکتے ہیں۔ ''صدر'' دراصل کسی چیز کو زبانی یاد کرنے میں ایک اہم عضو ہے۔ سورۃ العنکبوت کی آیت ۴۹ میں ہے: ﴿بَلۡ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِیۡ صُدُوۡرِ الَّذِيۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ ؕ﴾ ''دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔'' سید امیر علی ملیح آبادی (ت ۱۹۱۹م) ''مواہب الرحمٰن'' میں اس آیت سے حافظ قرآن کی فضیلت ظاہر کرتے ہیں۔ اس آیت کا ایک اور مطلب بھی ہے جسے امام ابن کثیر (ت۷۷۴ھ) نے ابن جریر کے حوالے سے نقل کیا ہے' یعنی آنحضرت ﷺ کا اُمّی ہونا' ان کے سینوں میں جو اہل کتاب میں سے ہیں۔

ج) اَیۡدِی

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ۝﴾ (البقرة)

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے شرع کا نوشتہ لکھتے ہیں' پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے آیا ہوا ہے تاکہ اس کے معاوضے میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کریں۔''

اس آیت میں لفظ ''اَیْدٍ'' استعمال ہوا ہے جو یَدٌ کی جمع ہے۔ لکھنے کا کام ہاتھ سے ہی ہوسکتا ہے۔ امام البیضاوی (ت ۷۹۱ھ) ''انوار التنزیل واسرار التاویل'' میں ذکر کرتے ہیں کہ اَیْدی یہاں تاکید کے لیے ہے' جیسے کوئی شخص کہتا ہے: کَتَبْتُهٗ بِیَمِیْنِیْ ''میں نے اسے اپنے دائیں ہاتھ سے لکھا''۔

د) اَرْجُل

''اَرْجُلٌ'' رِجْلٌ کی جمع ہے۔ یہ عضو باقاعدہ طور پر قرآن مجید میں علم کے پس منظر میں تو نہیں آیا' لیکن حصولِ علم کے لیے کسی کے پاس جانا پڑتا ہے' اس کے لیے پاؤں ہی تو معاون ہوتے ہیں۔ اس کا معاون ہونا حضرت موسیٰ d کے واقعہ سے نمایاں طور پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ چل کر اُس شخص کے پاس جاتے ہیں جس کا سورۃ الکہف کی آیات ۶۰ تا ۶۵ میں ذکر ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ d جس شخصیت کو ملنے کے لیے جاتے ہیں اس کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ ''اور اسے ہم نے اپنے پاس سے ایک خاص علم کی تعلیم دی۔'' اس سفر میں چلنے کی وجہ سے حضرت موسیٰ d کو تھکاوٹ بھی ہو گئی جس کے بارے میں فرماتے ہیں: ﴿لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا﴾ ''اس سفر سے ہمیں بہت تھکان ہوگئی ہے۔''

سورۃ الکہف کی ان آیات کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جن میں یہ قصہ بیان ہوا ہے:

> ''(ذرا ان کو وہ قصہ سناؤ جو موسیٰ d کو پیش آیا تھا) جبکہ موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا تھا کہ میں اپنا سفر ختم نہ کروں گا جب تک کہ دونوں دریاؤں کے سنگم پر نہ پہنچ جاؤں' ورنہ میں ایک زمانہ دراز تک چلتا ہی رہوں گا۔ پس جب وہ دونوں ان کے سنگم پر پہنچے تو اپنی مچھلی سے غافل ہو گئے' اور وہ نکل کر اس طرح دریا میں چلی گئی جیسے کوئی سرنگ لگی ہو۔ آگے جا کر موسیٰ نے اپنے خادم سے کہا لاؤ ہمارا ناشتہ' آج کے سفر میں تو ہم بری طرح تھک گئے ہیں۔ خادم نے کہا آپ نے دیکھا! یہ کیا ہوا؟ جب ہم اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے اس وقت مچھلی کا خیال نہ رہا اور شیطان نے مجھے ایسا غافل کر دیا کہ میں اس کا ذکر (آپ سے کرنا) بھول گیا۔ مچھلی تو عجیب طریقے سے نکل کر دریا میں چلی گئی۔ موسیٰ نے کہا اسی کی تو ہمیں تلاش تھی۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے قدموں پر پھر واپس ہوئے' اور وہاں انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا جسے ہم نے اپنی رحمت سے نوازا تھا اور اپنی طرف سے ایک خاص علم عطا کیا تھا۔''

ہ) اَللِّسَان

''اللسان'' یہ عضو اور ''اللغۃ'' دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے' اس کی جمع اَلْسِنَةٌ' السُن اور لسنٌ ہے۔ اللسان بطور عضو سورۃ البلد میں استعمال ہوا ہے: ﴿وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ﴾ ''اور زبان اور دو ہونٹ

دیے‘‘۔اس طرح اللسان ’’اللغۃ‘‘ کے معنی میں سورۂ مریم کی آیت ۹۷ میں بایں الفاظ آیا ہے:﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِکَ﴾(اے پیغمبر!) ہم نے یہ (قرآن) آپ کی زبان میں آسان (نازل) کیا ہے‘‘۔ قوتِ گویائی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اہم ترین نعمت قرار دیا ہے۔ سورۃ الرحمٰن میں فرمایا:﴿عَلَّمَهُ الْبَیَانَ ۝﴾’’اُسی نے اس کو بولنا سکھایا‘‘۔

یہاں قرآن حکیم کی روشنی میں چند اہم آلات اور انسانی بدن کے وہ اعضاء و جوارح جو حصولِ علم کے لیے مددگار ثابت ہوتے ہیں‘ انہیں اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ البتہ حصولِ علم کے لیے اور چیزیں بھی ہیں جن کے بغیر ہم علم حاصل نہیں کر سکتے‘ جیسے ذہانت‘ شوق‘ محنت‘ بنیادی خوراک‘ استاذ اور وقت وغیرہ۔ انہی باتوں کو الامام محمد بن ادریس الشافعیؒ (ت ۲۰۴ھ) نے درج ذیل خوبصورت اشعار کی صورت میں بیان کیا ہے:

أخی لن تنال العلم الا بستة　　سأنبیک عن تفصیلها ببیان
ذکاء وحرص واجتهاد وبلغة　　صحبة استاذ وطول زمان

حواشی

(۱) سنن الترمذی‘ کتاب القدر‘ باب ما جاء فی الرضا بالقضاء

(۲) الکامل فی الضعفاء لابن عدی ۵۲۲/۷۔

واضح رہے کہ ’’**زاد المسیر فی علم التفسیر**‘‘ (طبع اولیٰ‘ مکتب اسلامی) کے حاشیہ میں درج ہے کہ اس حدیث کی سند میں ایک راوی الحسن بن یحییٰ الخشنی ہے جس کے بارے میں ’’التقریب‘‘ میں ہے کہ وہ کثیر الغلط تھا۔ اسی لیے جمہور محدثین کے نزدیک اس روایت کی اللہ کے رسول ﷺ کی طرف نسبت ثابت نہیں ہے اور یہ باطل و منکر روایت ہے۔ امام ابن جریر طبری نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے قول کے طور پر اس روایت کو ’’صحیح‘‘ اور امام ابن تیمیہؒ نے ’’معروف‘‘ کہا ہے۔

بیادِ حافظ احمد یار مرحوم

پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم ومغفور، سابق صدر شعبہ علومِ اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، وہ خوش قسمت انسان تھے جن کی تقریباً ساری زندگی قرآن حکیم کی خدمت میں بسر ہوئی۔ ۱۹۸۰ء میں یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ قرآن اکیڈمی لاہور کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہوئے۔ یہاں دوسالہ رجوع الی القرآن کورس کا آغاز ہوا تو اس کے نصاب میں شامل متعدد اہم مضامین کی تدریس کی ذمہ داری محترم حافظ صاحب مرحوم کے حصے میں آئی۔ ان میں اہم ترین مضمون ترجمۂ قرآن حکیم تھا، جس کی تدریس صرفی ونحوی قواعد کے انطباق کے ساتھ کرنا پیش نظر تھا۔ چنانچہ حافظ صاحب مرحوم پہلے سال کے دوران طلبہ کو صرفی ونحوی قواعد اس انداز سے ازبر کرا دیتے کہ قرآن فہمی کے لیے انہیں ایک ٹھوس بنیاد فراہم ہو جاتی، اور پھر دوسرے سال کے دوران عربی قواعد کا انطباق کرتے ہوئے ترجمۂ قرآن کی تدریس فرماتے۔ یہ مشکل، کٹھن اور نازک ذمہ داری حافظ صاحب مرحوم نے کچھ ایسی لگن، محنت اور دلجمعی کے ساتھ ادا کی کہ وہ طالبانِ علم قرآن کے لیے ایک نہایت قیمتی اثاثہ ثابت ہوا۔ اس انداز سے ترجمۂ قرآن آپ نے رجوع الی القرآن کورس کے متعدد sessions کو کروایا۔ ان کورسز کے طلبہ میں دُنیوی تعلیم کے اعتبار سے ڈاکٹرز، انجینئرز، ایم اے اور اس سے اوپر کے ڈگری ہولڈرز شامل تھے۔

۸۸۔۱۹۸۷ء میں حافظ صاحب مرحوم کے کلاس روم لیکچرز ریکارڈ کیے گئے اور آڈیو کیسٹس کی صورت میں ان سے استفادہ کیا جانے لگا۔ آپ کے شاگردانِ رشید میں سے جناب لطف الرحمٰن خان کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ انہوں نے ان لیکچرز کو کیسٹس سے سن کر تحریری صورت میں مرتب کرنے کا بیڑا اٹھایا اور وہ بڑی ہمت سے اس کام کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ ان کا مرتب کردہ ترجمۂ قرآن مع صرفی ونحوی تشریح حکمت قرآن کے صفحات میں باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔

قرآن اکیڈمی کے شعبہ سمع وبصر نے بعد ازاں ان ۱۸۹ لیکچرز کو ایک DVD میں یکجا کر کے افادۂ عام کی راہ مزید ہموار کر دی۔ ۱۸ فروری ۲۰۰۸ء کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں اس DVD کی تعارفی تقریب کا انعقاد ہوا، جس میں مختلف اصحابِ علم نے حافظ صاحب مرحوم کی زندگی اور قرآن حکیم کے ساتھ ان کے والہانہ لگاؤ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کی قرآنی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان خواتین وحضرات کے تاثرات افادۂ قارئین کے لیے زیرِنظر صفحات میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

(۱)

فنافی القرآن کے مقام پر فائز عاشق قرآن

حافظ عاکف سعید
ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی لاہور

آج کی تقریب' جیسا کہ اخباری اعلان سے ظاہر ہے' ترجمۂ قرآن حکیم کی DVD کی تعارفی تقریب ہے۔اس DVD کی ایک خاص بات یہ ہے کہ نہ صرف اس ایک DVD میں مکمل ترجمۂ قرآن محفوظ کرلیا گیا ہے' بلکہ قواعدِ عربی کا لحاظ کرتے ہوئے طالبانِ قرآن کی سہولت کے لیے الفاظ وآیات کی صرفی ونحوی تشریح ووضاحت بھی اس میں شامل ہے' جس نے اس کی افادیت کو دوچند کردیا ہے۔

دوسری خاص بات جو میرے نزدیک بہت اہم ہے' یہ ہے کہ قرآن حکیم کا صرفی ونحوی تشریح کے ساتھ یہ گراں قدر ترجمہ ایک ایسے شفیق بزرگ اور نہایت قابل احترام استاد پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم کی زبان سے ہے جن کا قرآن حکیم کے ساتھ والہانہ لگاؤ ایک ضرب المثل کا درجہ رکھتا ہے۔وہ خدمت قرآنی کے بے پناہ جذبے سے سرشار ایک ایسے عاشق قرآن تھے جن کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ فنافی القرآن کے مقام پر فائز تھے۔چنانچہ قرآن کے ساتھ ان کے اس والہانہ تعلق کا مظہر یہ تھا کہ قرآن کی زبان' قرآن حکیم کا رسم الخط' قرآن حکیم کی قراءت' قرآن حکیم کے اعراب اور رموز واوقاف کے ساتھ ساتھ قراءاتِ سبعہ جیسے دقیق علمی موضوعات بھی یکساں طور پر ان کی دلچسپی کا مرکز تھے۔یہی نہیں' قرآنی آیات کی خطاطی کے نمونے' چوٹی کے مصری قراء کے تلاوتِ قرآن مجید کے ریکارڈ' پوری دنیا کے مختلف ممالک میں طبع شدہ قرآن حکیم کے نادر نسخے اور بالخصوص روایتِ حفص عن عاصم کے علاوہ دیگر روایات خصوصاً روایتِ ورش اور روایت دوری کے مطابق کتابت شدہ مصاحف اور قرآن مجید کے مختلف تراجم جمع کرنے کا انہیں جنون کی حد تک شوق تھا۔

وہ بیک وقت قرآن حکیم کے معلم بھی تھے اور متعلّم بھی۔چنانچہ وہ اس حدیث مبارکہ کا مصداقِ کامل تھے کہ ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))۔مذکورہ بالا تمام علومِ قرآنی پر وہ ایک اتھارٹی کا درجہ رکھتے تھے۔بالخصوص رسمِ عثمانی کے تناظر میں آج کے دَور میں شائع شدہ عرب و دیگر ممالک کے رسم الخط اور علاماتِ ضبط پر اُن کے پائے کا شاید ہی کوئی اور عالم آج دنیا میں موجود ہو۔

الحمدللہ کہ مجھے یہ شرف حاصل ہوا کہ حافظ صاحب مرحوم کی حیاتِ طیبہ کے آخری آٹھ دس سال مَیں ان کے بہت قریب رہا۔یہ امر میرے لیے باعث سعادت تھا کہ وہ اپنے ذاتی اور گھریلو معاملات بھی مجھ

سے share کرتے تھے۔ آج محترم حافظ صاحب کی ذات تو میرا موضوع نہیں ہے' اس موضوع پر میرا ایک قدرے مفصل مضمون قبل ازیں حکمت قرآن کے ستمبر ۲۰۰۰ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔ تاہم آج موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی ذات کے حوالے سے میں مختصراً یہ چند جملے ضرور کہنا چاہوں گا کہ وہ بہت سادہ منش' درویش صفت' نہایت خلیق اور انتہائی خوددار انسان تھے۔ ان کے ظاہر و باطن میں دوئی نہیں تھی' بلکہ ان کا باطن ان کے ظاہر سے زیادہ صاف اور اُجلا تھا۔ بے پناہ وسعت مطالعہ رکھنے اور بے شمار علوم بالخصوص علومِ قرآنی اور عربی زبان میں بہت اونچا مقام رکھنے کے باوجود ان کا مزاج طالب علمانہ تھا اور کبر و عجب کا ان میں شائبہ تک نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قناعت' توکل اور تواضع کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ شہرت و ناموری سے دور رہ کر علم و تحقیق کے میدان میں بھرپور محنت کرنا اور مزید حصولِ علم کے لیے کوشاں رہنا ان کا شعار تھا۔

تعلیم و تعلّم اور تحقیق و جستجو کے میدان میں وہ perfection کے قائل تھے۔ وہ اگر کسی مضمون کا پرچہ مرتب کرتے تو اس عرق ریزی کے ساتھ کہ دیکھنے والے اصحابِ نظر عش عش کر اٹھیں۔ پرچہ چیک کرتے تو حق ادا کر دیتے۔ ان کے بہت سے شاگرد آج یہاں موجود ہیں' جن میں سے بعض خود اساتذہ اور پروفیسر بھی ہیں۔ وہ اپنا تجربہ مجھ سے بہتر بیان کر سکتے ہیں۔ بلاشبہ وہ ایک مثالی استاد تھے۔ کسی کتاب پر تبصرہ لکھنا ہوتا تو بار بار مطالعہ کرتے' جابجا notes لیتے' کتاب کے حسن و قبح دونوں پہلوؤں سے رائے زنی کرتے' comments دیتے اور پھر اپنے notes اور comments کو یوں جمع کرتے گویا ایک تحقیقی مقالہ پیش کرنا ہو۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ خدمت قرآنی کے حوالے سے جو ذمہ داری بھی کبھی ان پر ڈالی گئی انہوں نے اپنی پیرانہ سالی اور عوارض کی پرواہ کیے بغیر والہانہ انداز سے اسے نبھایا۔ ۱۹۸۹ء (۱۴۰۹ھ) کے ماہِ رمضان المبارک کا دورۂ ترجمۂ قرآن اس کی ایک درخشاں مثال ہے کہ اس زمانے میں انہیں ایک ایسا عارضہ لاحق تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے مسجد میں جا کر صرف فرض نماز ادا کرنا بھی محال تھا' لیکن اس حالت میں انہوں نے قرآن اکیڈمی میں ماہِ رمضان میں نماز تراویح کے ساتھ مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن کی تکمیل کر کے ایک ناممکن کام کو ممکن کر دکھایا۔ یہ پُر مشقت کام کم و بیش روزانہ پانچ گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ کسی بھی دوسرے شخص کے لیے ایسے حالات میں محض مسجد جا کر نماز ادا کرنا بھی ناممکنات کے درجے میں ہے' لیکن یہ عشق قرآنی کا اعجاز تھا کہ پورا مہینہ انہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود یہ مشقت برداشت کی۔ کسی بھی معروف شخصیت کے انتقال پر بالعموم یہ تعزیتی جملہ رسماً کہا جاتا ہے کہ مرحوم کی وفات سے پیدا ہونے والا خلا مدتوں پورا نہیں ہوگا—— لیکن میں علیٰ وجہ البصیرت یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ محترم حافظ صاحب مرحوم کے حوالے سے یہ بات صد فی صد درست ہے۔ آسمان ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے۔ **اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ وادخلہُ جنۃ الفردوس** (آمین یاربّ العالمین!) ❁❁

(۲)

حیاتِ احمد یارؒ

پروفیسر ڈاکٹر قاری محمد طاہر
مدیر ماہنامہ ''التجوید''، فیصل آباد

موت ایک حقیقت ہے، زندگی ایک سراب۔ بے نظر سراب کو حقیقت اور حقیقت کو سراب خیال کیے رکھتا ہے، جبکہ صاحبِ نظر و صاحبِ بصیرت ہی اصل حقیقت کا شناور ہوتا ہے۔ موت اگر کسی کے آنگن میں آئے تو ایک ہی مرتا ہے، لیکن اگر فرشتۂ اجل کسی نابغۂ روزگار کے دروازے پر دستک دے دے تو پوری قوم کا جنازہ نکل جاتا ہے۔ حافظ احمد یار مرحوم کی شخصیت بھی ایسی ہی شخصیات میں سے تھی۔ وہ علم کے دھنی اور تحقیق کے رسیا تھے۔ انہیں کتاب سے محبت نہیں تھی بلکہ عشق تھا۔ مہنگی سے مہنگی کتاب کہیں سے ملے حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ آپ کتاب دوست انسان تھے۔ اچھی کتابوں کی تلاش اور اچھی کتابوں کو جمع کرنا ان کا مشغلہ تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری بڑی بڑی لائبریریوں سے بھی بڑی تھی۔ کیونکہ بڑی لائبریری کا معیار علماء کے نزدیک تعداد کتب پر منحصر نہیں، بلکہ بڑی لائبریری وہی کہلاتی ہے جس میں نایاب و اہم کتب کا ذخیرہ موجود ہو۔ جس طرح مصحف عثمانی کا صرف ایک ورق اپنی قدامت کے لحاظ سے تاج کمپنی کے تمام مطبوعہ مصاحف پر بھاری ہے اسی طرح کوئی ایک نایاب کتاب جو کہیں نہ ملے وہ بڑی سے بڑی لائبریری پر فوقیت رکھتی ہے۔

حافظ احمد یار صاحب کا ذاتی ذخیرۂ کتب ایسی ہی بے شمار کتب کا مجموعہ ہے۔ نایاب کتب کے حصول میں وہ کسی بڑی سے بڑی قیمتی چیز کو فروخت کر دینے میں تأمل نہ کرتے اور اچھی کتاب حاصل کر کے انہیں ایک گونہ خوشی اور سکون کا احساس ہوتا، جس کا عموماً تذکرہ بھی فرماتے تھے۔ کتاب کا نام تو یاد نہیں، البتہ وہ کتاب بڑی نایاب تھی، جو حافظ صاحب کے ذخیرے میں موجود تھی۔ ٹیلی ویژن کے کچھ لوگ حافظ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ ہم اس کتاب کے حوالے سے ٹیلی ویژن پر باقاعدہ مفصل پروگرام ٹیلی کاسٹ کرنا چاہتے ہیں، وہ کتاب آپ ہمیں دے دیجیے اور منہ مانگے دام لے لیجیے۔ حافظ صاحب نے انکار فرمایا۔ اصرار و انکار کی کشمکش چلتی رہی، بولی بھی بڑھتی رہی۔ ٹیلی ویژن والے ہار گئے تو کہنے لگے وہ کتاب آپ ہمیں عاریتاً ہی دے دیجیے، ہم بحفاظت واپس کر دیں گے۔ حافظ صاحب نے فرمایا یہ بھی ممکن نہیں، میں تو وہ کتاب اپنے سکوٹر میں رکھ کر بھی باہر نہیں لے جاتا، مبادا سکوٹر کی ٹکر ہو، میں مر جاؤں اور کتاب ضائع ہو جائے۔ اس دلیل نے ٹیلی ویژن والوں کی ٹیم کو بے دلیل کر دیا اور وہ بے نیل مرام واپس لوٹ گئے۔

آپ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں اسلامیات کے لیکچرار بھی رہے۔ ذہن تخلیقی و تحقیقی تھا۔

طرحِ نو ڈالنے کی صلاحیت سے بھی مالا مال تھے۔لوگ لفظ نمائش سے تو شناسا تھے' مثلاً نمائش بدن' نمائش لباس' ذاتی نمائش' بڑی نمائش' چھوٹی نمائش وغیرہ' اور اس قسم کی تمام نمائشوں میں خوب دلچسپی بھی لیتے تھے۔لیکن کتابوں کی نمائش' یہ جملہ اور یہ ترکیب ہی سرے سے اجنبی اور غریب تھی۔کوئی جانتا تک نہ تھا کہ کتابوں کی بھی نمائش ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے۔حافظ صاحب نے کتب سیرت کی نمائش کی طرحِ نو ڈالی۔ جب آپ نے اس خیال کا اظہار لوگوں کے سامنے نہیں بلکہ بڑے بڑے پروفیسر حضرات کے سامنے کیا تو پذیرائی تو کیا ہوتی ہر ایک کے ماتھے پر سوالیہ نشان اُبھرا۔بعض نے تو اس خیال کو دیوانے کی بڑ قرار دیا اور تضحیک کی۔لیکن ہدف واضح ہو' مقصد سے لگن صادق ہو تو انسان ہنسنے والوں کی پرواہ نہیں کرتا بلکہ اسے اونچی اڑان میں ممد و معاون خیال کرتا ہے۔یوں بھی اہل جنوں سنگ زنی ہی میں جیتے ہیں اور لطف زندگی پاتے ہیں ؎

مرے جنوں کا ترے شہر میں گزارا نہیں
مجھے تو ایک بھی پتھر کسی نے مارا نہیں

آپ نے اُس وقت تک چھپنے والی کتب سیرت کی نمائش کا خوب اہتمام کیا۔یہ نمائش گھنٹے دو گھنٹے یا ایک سیشن نہیں بلکہ تین روز جاری رہی۔آپ نے ثابت کر دیا کہ نمائش صرف بدن کی یا کپڑے اور مٹی چینی کے برتنوں ہی کی نہیں ہوتی' نمائش کتب کی بھی ہوتی ہے۔کتابوں کی نمائش کی طرح آپ ہی نے ڈالی۔اب موقع بہ موقع نمائش کتب لگتی ہیں۔اہل علم کے لیے یہ صدقۂ جاریہ حافظ صاحب ہی کا رہین منت ہے۔ناشرین کتب کے لیے یہ دسترخوان حافظ صاحب ہی کا چنا ہوا ہے جس سے کتب فروش ہڈیاں بوٹیاں تلاش کرتے ہیں۔

میں حافظ صاحب کی زندگی کے اوراق کو پلٹتا ہوں تو آپ کی زندگی کا ایک ایک ورق ؎

از سر تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جا است!

کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔تمام اوصاف کا احاطہ کروں تو وقت قلیل' قرطاس کا دامن بھی کوتاہ۔البتہ ایک وصف کا اہتماماً ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔اللہ تعالیٰ نے حقوق العباد کی ادائیگی پر بڑا زور دیا ہے' بلکہ بعض نصوص کی رو سے حقوق اللہ پر حقوق العباد کی برتری کا واضح پتا چلتا ہے۔ایک روایت میں ہے:

((حَقُّ الْعَبْدِ مُقَدَّمٌ عَلٰی حَقِّ اللّٰہِ)) ''بندے کا حق اللہ کے حق پر مقدم ہے''۔

حافظ صاحب حقوق العباد کی ادائیگی میں بہت باریک بین تھے۔اس حوالے سے ان کی نظر اتنی گہری تھی کہ کسی عام آدمی کے خیال کی پرواز بھی وہاں نہیں پہنچ سکتی۔کسی کو خط لکھنا ہوتا اور بات بھی جواب طلب ہوتی تو جوابی لفافہ ارسال فرماتے۔میں نے ایک روز سوال کیا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ فرمانے لگے: ایک تو

ہم مرسل الیہ کا وقت کھوٹا کریں کہ وہ ہمارا خط پڑھے اور جواب لکھے' دوسرے اس پر مالی بوجھ بھی ڈال دیں' یہ قرین انصاف نہیں۔ حافظ صاحب کے فرمان کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا۔ ایک مرتبہ میں نے بھی حافظ صاحب کو خط لکھا اور جوابی لفافہ ارسال کیا۔ آپ نے جواب لکھا اور میرا بھیجا ہوا جوابی لفافہ جوں کا توں اپنے لفافہ میں واپس بھجوا دیا۔ کچھ عرصہ بعد اتفاقاً ملاقات ہوئی' میں نے عرض کیا کہ میرا یہ عمل تو آپ کی اتباع ہی کے طور پر تھا' تو آپ نے میرے لفافہ کو استعمال کیوں نہ کیا اور لفافہ واپس کیوں بھیج دیا؟ حافظ صاحب مسکرائے' بلکہ کھلکھلا کر ہنسے اور زبانِ حال سے فرمانے لگے: وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ

حافظ صاحب فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حجاز گئے تو کثرت سے عمرے ادا کیے' اتنے کہ نڈھال ہو گئے۔ ان کے بیٹے ڈاکٹر نعم العبد اس وقت سعودی عرب میں ملازم تھے۔ انہوں نے اپنے والد کو ادب سے منع کیا کہ اب آرام کیجیے' مزید مشقت آپ کی صحت پر منفی اثر ڈالے گی۔ حافظ صاحب فرمانے لگے بس ایک عمرہ اور کرنے دو' وہ بہت ضروری ہے اور باوجود منع کرنے کے پھر عمرے کا احرام باندھا اور ہانپتے کانپتے وہ عمرہ بھی ادا کیا۔ بیٹے نے پوچھا آخر اس عمرہ کے لیے اتنا اصرار کیوں تھا؟ فرمانے لگے کہ یہ عمرہ میں نے اس شخص کی طرف سے کیا ہے جو کبھی پشتوں پہلے ہمارے خاندان میں پہلا مسلمان ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون ہوگا' تاہم میں آج اسی کے طفیل اسلام کی دولت سے مالا مال ہوں اور توحید کا ماننے والا ہوں۔ اسی کے سبب اللہ کے گھر پر حاضری کی سعادت ملی ہے۔ لہٰذا اس کی طرف سے عمرہ ادا نہ کرنا اس کی حق تلفی اور حق العباد میں کوتاہی کے مترادف تھا۔ اب اس کی طرف سے عمرہ ادا کر کے ذہن ہلکا ہو گیا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد حافظ احمد یار' ڈاکٹر اسرار احمد صدر مؤسس انجمن خدام القرآن لاہور کے ادارہ (قرآن اکیڈمی) سے منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصہ ان کے ادارے میں پڑھاتے رہے' پھر تصنیف و تالیف کی خدمت سرانجام دینے لگے۔ کئی برس پہلے کی بات ہے میں ان سے ملنے کے لیے ان کے گھر حاضر ہوا۔ مجھے کمرے میں بٹھایا لیکن میں نے ان کے چہرہ پر پہلے جیسی شگفتگی نہ دیکھی۔ میں نے محسوس کیا اور عرض کیا حافظ صاحب شاید میں بے وقت آ گیا ہوں' میرے آنے سے آپ کو زحمت ہوئی ہے۔ فرمانے لگے تم بے وقت تو نہیں آئے ہو اور تمہارے آنے سے مجھے خوشی بھی ہوئی ہے' تاہم ایک بات کی پریشانی ہے۔ فرمانے لگے یہ وقت میرا نہیں ہے بلکہ ڈاکٹر اسرار صاحب کا ہے۔ میں ان کا ملازم ہوں' انہوں نے میری صحت کے پیش نظر مجھے یہ سہولت دے رکھی ہے کہ میں اوقاتِ کار میں ان کے ادارے میں نہ جاؤں بلکہ گھر پر ہی رہ کر اتنے گھنٹے تفسیر کا کام کرتا رہوں۔ اس لحاظ سے یہ وقت ان کی امانت ہے۔ چونکہ تمہیں پتا نہ تھا اس لیے تم پر دوش نہیں' البتہ اب اتنا وقت شام کو مزید بیٹھوں گا۔ جب میں آپ سے رخصت ہونے لگا تو حافظ صاحب نے اسی وقت گھڑی دیکھی اور منٹ شمار کیے۔

حافظ احمد یار علم کی آبرو اور قلم کا وقار تھے۔ قرآن کے عاشق اور قرآنی علوم کے متوالے۔ انہیں قرآن کے ساتھ ایسی محبت تھی کہ جنون بھی مات کھائے۔ وہ علم اور عمل کے آدمی تھے۔ بہت کچھ جانتے' اتنا

کہ کئی عالموں پر بھاری' لیکن چہرہ بشرہ علم کے مصنوعی تکلف سے بالکل عاری۔ دیکھنے والا انہیں زیادہ سے زیادہ دو وقت کا امام تصور کرتا۔ سادہ رہتے' سادہ پہنتے' سادہ قال' سادہ حال' جفاکشی اور وفا کیشی زندگی کا حصہ تھی۔ ان کو پہچاننے کے لیے گہر شناس ہونا ضروری تھا۔ ہمیشہ ہنس کر بلکہ کھل کر ملتے۔ گفتار کے مجاہد اور کردار کے غازی تھے۔ خود زحمت اٹھاتے' دوسروں کے لیے رحمت بنتے تھے۔ محبت سب سے' نفرت کسی سے نہیں پر عمل کرتے۔ کوئی زیادتی بھی کرتا تو ''جا تیرا بھلا ہو'' کی تصویر بن جاتے۔

عمر بھر قرآن پڑھا' قرآن پڑھایا۔ قرآن کے لیے پڑھا اور قرآن کے لیے ہی لکھا۔ ان کے قلم سے بڑی بڑی تحریریں نکلیں۔ سب کا حوالہ قرآن ہی تھا۔ یہی متاعِ حیات لے کر اللہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ اللہ ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے اور چار سو کشادہ فرمائے۔ مجھے یقین ہے کہ آخرت میں حافظ صاحب قرآن کے سائے ہی میں اٹھیں گے' اسی سائے میں میدانِ حشر میں آئیں گے اور قرآن کے حوالے ہی سے نوید بخشش حاصل کریں گے ۔

ہم ایسے لوگ تم کہاں سے لاؤ گے
ڈھونڈنے نکلو گے لیکن ہمیں نہ پاؤ گے

ان کے لواحقین خصوصاً ڈاکٹر نعم العبد صاحب سے ہماری درخواست ہو گی کہ وہ حافظ صاحب کے ذخیرۂ کتب کا اکابر اہل علم کے مشورہ سے صحیح مصرف تلاش کریں تا کہ حافظ صاحب کی روح آسودہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کی عمر بھر کی علمی جمع پونجی کرم کتابی کی خوراک کا ذریعہ بن جائے۔ ان کے لواحقین کو اس بات سے بھی باخبر رہنا چاہیے کہ حافظ صاحب کی کتابیں کسی ایسے شکاری کے ہتھے بھی نہ چڑھ جائیں جو علم کو سیروں اور منوں میں تولتا ہے اور اس تول کا مول وصول کرتا ہے۔ ایسے شکاری کرم کتابی سے بھی زیادہ خطرناک ہوا کرتے ہیں۔

حافظ صاحب نے حیاتِ مستعار کو پورا کیا اور مستعیر کو متاعِ حیات لوٹا کر وعدہ ایفا کر گئے لیکن وہ حیات ہیں۔ بھلا اہل عشق بھی کبھی مرتے ہیں' نہیں اہل عشق مر کر بھی زندہ رہتے ہیں۔ کیونکہ زندگی سانس کے آنے جانے کا نام نہیں' زندگی مقصدیت کا نام ہے۔ زندگی وقت گزاری نہیں بلکہ کارگزاری کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر زندگی میں مقصدیت کا عنصر موجود ہو تو انسان اصل حیات حاصل کرتا ہے۔ اگر مقصدیت مفقود ہو تو انسان چلتی پھرتی لاش سے زیادہ کچھ نہیں۔ حافظ احمد یار با مقصد زندگی کی علامت ہیں۔ اسی لیے دنیا سے رخصت ہونے کے باوجود دلوں میں حیات ہیں ۔

کھول کے کیا بیاں کروں سِرِّ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف' مرگ حیاتِ بے شرف

(۳)

حافظ احمد یارؒ: جہد مسلسل کا پیکر

محترمہ ڈاکٹر جمیلہ شوکت

سابقہ چیئر پرسن شعبہ علومِ اسلامیہ، پنجاب یونیورسٹی

کتنی خوش نصیب ہیں وہ ہستیاں، وہ نفوسِ قدسیہ جو اس فانی دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں۔ نجی حلقوں اور عوامی جلسوں میں ان کے اخلاقِ حسنہ اور علمی خدمات کا تذکرہ ہوتا رہتا ہے اور لوگوں کے لیے مشعل راہ بھی بنتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں میں سے ایک قدآور شخصیت استاذ محترم حافظ احمد یار مرحوم ومغفور کی تھی، جن کی وفات کو دس سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، لیکن وہ اپنے آثارِ جلیلہ اور اخلاقِ فاضلہ کی وجہ سے ہم سب کی گفتگو کا موضوع ومحور بنے رہتے ہیں۔ علومِ دینیہ بالخصوص سرچشمۂ علوم، قرآن حکیم سے متعلق کوئی پروگرام یا کوئی مجلس منعقد ہو، ان کی للّٰہیت اور سرچشمۂ خزینۂ علوم، اللہ کے آخری کلام سے ان کی وابستگی اور اس کے علوم وفنون پر ان کی دسترس کا ذکر خیر ضرور ہوتا ہے۔ اس مجلس میں موجود بعض حاضرین محترم کو یقیناً یاد ہوگا کہ آج سے چند سال قبل پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات نے حافظ صاحب مرحوم کی خدماتِ جلیلہ کے اعتراف میں ایک مجلس کا انعقاد کیا تھا، جس میں حافظ صاحب کے معاصرین، تلامذہ اور متبعین نے شرکت فرمائی اور ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ازاں بعد ان تاثرات کو شائع بھی کیا گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج کی یہ مجلس بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مؤسس انجمن خدام القرآن محترم ومکرم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ اور ان کے سعادت مند صاحبزادوں بالخصوص عزیز محترم حافظ عاکف سعید نے استاذ محترم کی جو توقیر کی اور ان کے ۱۸۹ دروسِ قرآن کو محفوظ کر کے طالبان ومشتاقانِ قرآن تک پہنچایا، ہم سب ان کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں۔

اس افراتفری اور ہنگامہ خیز دور میں ہمارے اعمالِ سیئہ کے سبب ہر شے سے خیر و برکت ختم ہوتی جارہی ہے۔ کوئی تعمیری اور اچھا کام نہ کر سکنے کا سبب عدم فرصت کو ٹھہرایا جارہا ہے۔ حافظ صاحب کے قرآن حکیم کے لیکچرز کی افادیت کے پیش نظر ان کے سعادت مند صاحبزادوں ڈاکٹر نعم العبد اور کرنل (ریٹائرڈ) ذوالقرنین نے ان تمام کیسٹس کو پہلے CD اور پھر DVD پر منتقل کیا تاکہ قرآن مبین سے تعلق رکھنے والے، سمجھنے اور سیکھنے کا شوق رکھنے والوں کے لیے سفر وحضر میں بآسانی اس سے استفادہ ممکن ہو سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کو بہترین اجر سے نوازے اور ہم سب کو اپنے والدین کے لیے صدقۂ جاریہ بننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

حافظ صاحب کا ایک اور منفرد کام قرآن حکیم کی صرفی ونحوی اور اعرابی بحثوں کے ساتھ مفصل تفسیر ''لغات واعرابِ قرآن'' تھی' جو ان کی تکمیل پسند طبیعت کی وجہ سے ابھی سورۃ البقرۃ کے نصف پر ہی پہنچی تھی کہ یہ عارفِ قرآن اپنے رب سے جاملا۔ اس پائے کی تفسیر کی تکمیل کے لیے تبحر علمی کے ساتھ ساتھ صبر وثبات کی بھی ضرورت ہے۔ کل ہی یہ خوشخبری ملی کہ حافظ صاحب کے شاگرد رشید جناب لطف الرحمٰن صاحب' جن کے پاس نہ ایم اے اسلامیات کی ڈگری ہے اور نہ ہی وہ اسلامیات کے روایتی مدرس ہیں' انہوں نے اس عظیم کام کی تکمیل کا آغاز کر دیا ہے۔ رب کریم انہیں اس کام میں استقامت عطا فرمائے اور ہر مرحلے پر ان کی راہنمائی فرمائے۔ آمین!

حافظ صاحب مرحوم کی زندگی بچپن سے لے کر وفات تک جہد مسلسل سے عبارت ہے۔ حافظ صاحب کی پیدائش ونشو ونما ایسے علاقے اور ماحول میں ہوئی جہاں تعلیم کا رواج نہ تھا' لہٰذا ایسی پسماندہ بستی میں کسی سکول کا وجود ہونا بھی ممکن نہیں تھا۔ لیکن اللہ کریم نے اپنے اس بندے کے لیے حصول علم کی راہیں کھولیں اور کٹھن معاشرتی اور کمزور معاشی حالات میں بھی متدین والدین نے بیٹے کی تعلیم کا بندوبست کیا۔ ان کی والدہ کا تعلیم سے محبت اور تعلق کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہیں بیٹے کی تعلیم جاری رکھنے کے لیے اپنے چھوٹے موٹے اثاثے یعنی زیور' جو ہر عورت کی کمزوری اور خواہش ہوتے ہیں' فروخت کرنا پڑے۔ سکول گھر سے کئی میل دور تھا' روزانہ آنے جانے کا سفر پیدل ہوتا۔ جذبہ صادق اور حصولِ علم کی لگن ہو تو یہ صعوبتیں اور تکالیف چنداں گراں نہیں گزرتیں۔

۱۹۳۷ء میں حافظ صاحب نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تو والدین کو ان کا گھر بسانے کی فکر لاحق ہوئی' لہٰذا انہوں نے یہ فریضہ بھی باحسن انجام دیا۔ گھر داری کی ذمہ داری نے ملازمت پر مجبور کیا کہ ان کا تعلق کسی وڈیرے یا زمیندار گھرانے سے نہیں تھا کہ کسب معاش سے بے نیاز ہو کر حصولِ علم کی اگلی منزلیں طے کرتے۔ ۱۹۳۷ء سے غالباً ۱۹۵۴ء تک مختلف ملازمتوں میں مصروف رہنے کے ساتھ ساتھ حصول علم کے لیے کوشاں رہے۔ اس عرصے میں انہوں نے جے وی اور اسی دوران نو ماہ کے مختصر عرصے میں قرآن حکیم بھی حفظ کیا۔ بی اے' منشی فاضل' ایم اے عربی اور ایم اے علومِ اسلامیہ وغیرہ کے امتحانات پاس کیے اور قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے جامعہ محمدی کے اجل اساتذہ سے استفادہ بھی کیا۔ یعنی میٹرک کے بعد ایک طالب علم جو سفر چھ سات سال میں طے کرتا ہے حافظ صاحب نے تقریباً سترہ اٹھارہ سال میں طے کیا۔ یہاں یہ بات بڑی اہم ہے کہ ان کا مطالعہ بڑا وسیع اور اس میں تنوع تھا' جس کی شہادت ان کی تحریروں' لیکچرز اور مختلف علوم اور موضوعات پر ان کی مدلل اور جامع گفتگو اور ذاتی لائبریری میں موجود قیمتی ذخیرۂ کتب سے ملتی ہے۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر حافظ صاحب کے ورثاء سے درخواست کروں گی کہ ان کی بیش قیمت لائبریری' جس کی حفاظت وہ دل وجان سے کر رہے ہیں' افادۂ عام کے لیے کسی ایسے

ادارے یا اداروں کو دے دی جائیں جہاں انہوں نے اپنا بیشتر وقت تعلیم و تدریس کے ذریعے دین کی خدمت میں گزارا اور جہاں اب بھی اللہ کے دین کے غلبہ اور ترویج کے لیے سنجیدہ کوششیں ہو رہی ہیں۔

حافظ صاحب کا تعلق اللہ کے بندوں کے اس طبقہ سے تھا جس کے بارے میں خود قرآن مجید ﴿اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ کے الفاظ میں گواہی دے رہا ہے۔ ان کی زندگی میں دین و دنیا کا حسین امتزاج پایا جاتا تھا۔ قرآن کی ہمہ وقت خدمت اور اللہ کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اہل خانہ سے محبت و انس، بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت اور ان کی عملی زندگی کے لیے سوچ بچار، عزیز و اقارب سے میل ملاقات، رفقاء کے ساتھ خوش اخلاق و ملنسار، طلبہ کے لیے نہایت شفیق اور خیر خواہ، ضرورت مند کی حاجت کو پورا کرنے میں مستعد و مصروف۔ یہ تھیں صفاتِ حمیدہ جو ان کے اندر بتوفیق الٰہی بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

حافظ صاحب کے شاگردانِ رشید اور ان کے رفقاء اس بات کے عینی شاہد ہیں کہ وہ خشک مزاج زاہد و عابد انسان نہ تھے بلکہ بڑے زندہ دل اور خوش گفتار تھے۔ جب وہ کسی موضوع پر گفتگو فرماتے تو سامعین کو مناسب حال لطائف اور واقعات سے بھی محظوظ کرتے رہتے اور اس طرح سننے والے تازہ دم ہو جاتے۔

آخر میں صدرِ مؤسس انجمن خدام القرآن، ناظم اعلیٰ مرکزی انجمن خدام القرآن، عزیز محترم حافظ عاکف سعید، ڈاکٹر نعم العبد، کرنل ذوالقرنین اور حافظ صاحب مرحوم کی صاحبزادیوں کو اس مفید اجتماع کے انعقاد پر مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ ربّ جلیل سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے اور اپنے رسول علیہ الصلاۃ والسلام کے بتائے ہوئے راستے اور اس کی راہنمائی میں زندگی بسر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہم روزِ محشر خادم قرآن حافظ صاحب کی معیت اور صحبت میں ایک بار پھر جمع ہو سکیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

(۴)

ہمارے والد محترم: محبت قرآن کا مظہر

محترمہ ڈاکٹر نضرۃ النعیم
دختر حافظ احمد یار مرحوم

آج کی اس تقریب کا انعقاد ہم سب کے لیے باعثِ مسرت و سعادت ہے کہ ہم سب آج ایک ایسے درویش صفت انسان کو یاد کر رہے ہیں جن کی ساری زندگی اللہ پر غیر متزلزل توکل کے ساتھ بسر ہوئی اور میرے خیال میں آج ان کی وفات کے تقریباً ۱۲ سال بعد اس تقریب کا انعقاد بھی ان کے اسی توکل کے سلسلے کی ہی ایک کڑی ہے۔ وہ اپنا ہر کام ہر ممکن کوشش کے بعد اللہ کے سپرد کر دیا کرتے تھے اور ان کے تمام کام بڑے احسن طریقے سے انجام پا جایا کرتے تھے۔ آج ان کے بیٹے اور بیٹوں جیسے عزیز و مخلص

رفقاء مل کر ان کے لیکچرز کو جدید طریقۂ کار کے عین مطابق سی ڈیز کی شکل میں محفوظ کر کے اور تمام طالبانِ علم تک ان کی رسائی کا بہترین انتظام کر کے یقیناً اس مشن کی تکمیل میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں جو مشن مرحوم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب کا تھا۔ یعنی قرآن کی بہتر تعلیم و تفہیم کے لیے کوشاں رہنے والے حافظ احمد یار مرحوم کے مشن کو جدید ذرائع سے آراستہ کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش میں ہاتھ بٹانے والے ہر فرد کو اپنی رحمت سے اجر کثیر سے نوازے۔ آمین!

کسی فلسفی کا قول ہے: ''اگر تم کسی کی عظمت کا اندازہ لگانا چاہتے ہو تو اس کی موت کا انتظار کرو''۔ آج اس قول کی صداقت پر مجھے یوں یقین آیا کہ میرے والد صاحب جو اپنی زندگی میں صرف حافظ صاحب کہلوانا پسند کرتے تھے آج ان کی وفات کے بعد ہم سب انہیں خادمِ قرآن اور عاشقِ قرآن کے نام سے یاد کر رہے ہیں اور صرف یاد نہیں کر رہے بلکہ اس کا اقرار کر رہے ہیں کہ قرآن پاک سے جتنی محبت ان کے دل میں موجود تھی وہ شاید ہی کسی اور کے حصے میں آئی ہو۔ یہ تو ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص کرم تھا' بقول شاعر: ؎

جسے چاہا در پہ بلا لیا' جسے چاہا اپنا بنا لیا
یہ بڑے کرم کے ہیں فیصلے' یہ بڑے نصیب کی بات ہے

اور یہ ہمارے لیے بڑے نصیب کی بات ہے کہ ہم ان کی اولاد ہیں۔ اولاد جس میں ماں باپ کی شبیہہ نظر آتی ہے۔ اگرچہ ہم اپنے عظیم باپ کی تمام خوبیوں سے متصف نہیں ہیں مگر ہر قدم پر ہماری یہ دعا ہے کہ یا اللہ ہمیں بالکل ویسا بنا دے جیسا ہمارے والد ہمیں دیکھنا چاہتے تھے۔ یقیناً وہ ہمیں بھی اپنی طرح اس سیدھے راستے پر چلتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے جس راستے پر چلنے سے دنیا و آخرت کی تمام نعمتیں انسان کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ یا اللہ! ہماری دعاؤں میں تاثیر دے اور انہیں قبول فرما۔ آمین!

والد محترم پروفیسر حافظ احمد یار کی قرآن سے محبت ان کے ہر ہر عمل سے جھلکتی ہے' مثلاً انہوں نے اپنے سب بچوں کے نام قرآن پاک سے منتخب کر کے رکھے۔ اپنے بچوں کو' خاص طور پر بچیوں کو' قرآن پاک خود پڑھایا' کیونکہ قرآن پاک کی درست تلاوت میں کسی کوتاہی کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ قرآن پاک پڑھتے وقت جہاں کسی بچی نے دوسری یا تیسری غلطی کی وہیں سبق روک دیا جاتا تھا اور سبق اچھی طرح یاد کرنے کا حکم ملتا تھا۔ کبھی قرآن پاک جلد ختم کرنے کی بات نہیں کرتے تھے' بلکہ ہمیشہ صحیح قرآن پڑھنے کی تلقین کرتے تھے' خواہ ایک صفحے پر دو دن لگ جائیں۔

ہمارے والد محترم نے ۲۳ سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کرنے کی سعادت حاصل کی۔ عین عالمِ شباب میں ان کی قرآن پاک سے یہ محبت ان کی تمام زندگی ان کے ساتھ ساتھ رہی۔ ان کے معمولات زندگی میں ایک اہم کام ہر سال باقاعدگی سے رمضان میں نماز تراویح میں قرآن پاک سنانا تھا۔ اس کے لیے وہ رمضان سے ایک دو ماہ پہلے یعنی رجب اور شعبان میں ہی اپنے دنیاوی کاموں پر توجہ کم کر کے اپنی زیادہ توجہ قرآن پاک کی تلاوت پر مرکوز کر دیا کرتے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی زندگی میں

قرآن پاک کو دیگر تمام امور سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ وہ قرآن پاک کی تحفیظ کے بعد اس کو ہمیشہ یاد رکھنے کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔ ہمیشہ ہمیں کہا کرتے تھے کہ اگر قرآن پاک کی ایک آیت کو یاد کر کے بھلا دیا جائے تو یہ بہت بڑا گناہ ہے' لہٰذا قرآن پاک کے جتنے حصہ کو بھی یاد کروا سے ہمیشہ یاد رکھو۔

ہمارے والد صاحب کے ایک قریبی دوست نے اپنے بیٹے کو بڑی محبت سے قرآن حفظ کروایا۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا رمضان میں نماز تراویح میں قرآن پاک سنائے' مگر ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکے کو کسی مسجد میں تراویح پڑھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا اور اس صورت حال میں یقیناً وہ باپ بیٹا دلبرداشتہ ہو رہے تھے۔ جب ہمارے والد محترم کے سامنے یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو آپ نے اپنے دوست سے کہا کہ میں اس بچے کا سامع بنوں گا اور یہ ہمارے گھر میں نماز تراویح پڑھائے گا۔ چنانچہ آپ اس بچے کے پیچھے سامع بن کر پورا قرآن پورا رمضان سنتے رہے۔ آپ کی اس حوصلہ افزائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ بچہ اس کے بعد ہر سال رمضان میں نماز تراویح پڑھانے کے قابل ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد مختلف مساجد میں قرآن مجید تراویح میں سنانا اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن گیا۔ بخدا ایسی شمع جلانا جس کی لو کبھی مدھم نہ ہو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ ایسے کاموں میں اپنی ذات کی نفی کرنی پڑتی ہے اور اپنی ذات کی نفی صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو دنیاوی عزت اور اعلیٰ عہدوں سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے والد پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم بھی ایسے چیدہ لوگوں میں سے تھے۔ اللّٰھم اغفرله وارحمه۔

پروفیسر حافظ احمد یار مرحوم ومغفور کی قرآن سے محبت اور قرآن سے متعلق علوم پر علمی وتحقیقی کام کے بارے میں کئی گھنٹے گفتگو کی جاسکتی ہے مگر وقت کی کمی کا مسئلہ ہمیشہ آڑے آتا ہے۔ ہم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ جب ہم سب ان سی ڈیز سے استفادہ کریں گے تو میرے والد محترم کی حبِّ قرآن ایک خوشبو کی طرح ہمارے اردگرد پھیل جائے گی جس سے ہم سب اپنی اپنی استطاعت کے مطابق فیض حاصل کر سکیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک اس کاوش میں شریک ہر فرد کی مساعیٔ جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور ہم سب کو اس کاوش سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے! آمین!

وما توفیقی الا باللّٰہ العلی العظیم

حافظ صاحب مرحوم کا ذخیرۂ کتب

مندرجہ بالا تأثرات میں حافظ احمد یار صاحبؒ کی بیش قیمت لائبریری کا تذکرہ بھی ہوا ہے اور ڈاکٹر قاری محمد طاہر صاحب اور ڈاکٹر جمیلہ شوکت صاحبہ نے حافظ صاحب کے بچوں کو یہ پرخلوص مشورہ بھی دیا ہے کہ ان کا ذخیرۂ کتب کسی ایسے ادارے کے سپرد کر دیا جائے جہاں انہوں نے اپنا بیشتر وقت تعلیم وتدریس کے ذریعے دین کی خدمت میں گزارا اور جہاں اب بھی اللہ کے دین کے غلبے اور ترویج کے لیے سنجیدہ کوششیں ہو رہی ہیں' تاکہ حافظ صاحب کی روح آسودہ ہو۔ چنانچہ یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ حافظ صاحب مرحوم کے صاحب زادے جناب ڈاکٹر نعم العبد نے اپنے بھائی بہنوں کی رضامندی سے یہ گراں قدر علمی ورثہ قرآن اکیڈمی لائبریری کو ہدیہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ان دنوں کتب کی مرحلہ وار نقل مکانی کا سلسلہ جاری ہے۔ فجزاهم اللّٰه احسن الجزاء!

کتاب نما

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

(۱)

نام کتاب : انسانی دل اور قبولِ اسلام

مصنف : ڈاکٹر گوہر مشتاق

ضخامت:52 صفحات قیمت:30 روپے

ناشر: مکتبہ خواتین میگزین' نزد منصورہ' ملتان روڈ لاہور

ملنے کا پتہ: مکتبہ معارف اسلامی' منصورہ ملتان روڈ لاہور' فون:042-5432419

کتاب کے مصنف ڈاکٹر گوہر مشتاق ذہین فطین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمان ہیں۔انہیں دین کے ساتھ گہری وابستگی ہے اور ان کے دل میں اُمت مسلمہ کا درد بھرا ہوا ہے۔

اس کتاب میں انہوں نے جدید تحقیق کی روشنی میں مستند حوالوں کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ انسانی جسم میں صرف دماغ ہی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ یہ صلاحیت دل میں بھی ہے۔قرآن مجید بھی اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ قرآن میں ہر اس شخص کے لیے عبرت کا سبق ہے جو دل رکھتا ہے یا وہ توجہ سے سنے۔(ق:۳۷) اسی طرح حدیث میں بھی بتایا گیا ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے' اگر وہ صحیح رہے تو سارا جسم صحیح رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے' اور وہ ٹکڑا دل ہے۔

اسلام کے پیش کردہ ان حقائق کو جدید سائنس تسلیم کر کے دین اسلام کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر رہی ہے۔مشہور ڈاکٹر آرمر (Dr. Jandrew Armour) کی تحقیق کے مطابق ''انسانی دل کے پاس اپنا چھوٹا سا دماغ ہوتا ہے جو اس قابل ہوتا ہے کہ وہ اپنی مدد آپ کے تحت مشکل قسم کے تجزیے کر سکتا ہے''۔امریکی سائنس دان ڈاکٹر رولن میکریٹی (Dr. Rollin McCrety) اپنی تحقیق بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:''حاصل کلام یہ کہ انسانی دل اس طرح کام کرتا ہے کہ اس کا ایک اپنا دماغ ہوتا ہے''۔

مصنف نے ثابت کیا ہے کہ کفر سے اسلام میں داخل ہونے والے شخص کا دماغ نہیں بلکہ دل اس تبدیلی کا فیصلہ کرتا ہے۔

ایک اہم بات مصنف نے یہ لکھی ہے کہ کتابوں، ٹی وی یا انٹرنیٹ سے حاصل کیا ہوا علم ''معلومات'' (information) تو دیتا ہے مگر کردار کی پختگی اور یقین کی دولت فراہم نہیں کرتا، اس کے لیے علماء کی صحبت سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ کیونکہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ ان کے سامنے گھٹنے ٹیک کر بیٹھنے سے ہی اسلام کی صحیح سمجھ آئے گی اور ایمان و کردار میں مضبوطی پیدا ہوگی۔

یہ چھوٹی سی کتاب بڑی قابل قدر معلومات فراہم کرتی ہے۔ تحقیق و جستجو کا ذوق رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ مفید رہے گا۔

(۲)

نام کتاب : داڑھی کی اہمیت

مصنف : ڈاکٹر گوہر مشتاق

مترجم : مشتاق حسین چودھری

ضخامت: 72 صفحات قیمت: 40 روپے

ناشر: اذان سحر پبلی کیشنز، نزد منصورہ، ملتان روڈ، لاہور، فون: 042-5435667

ملنے کا پتہ: مکتبہ معارف اسلامی، منصورہ ملتان روڈ لاہور، فون: 042-5432419

مسلمانوں کے ہاں داڑھی کے مسنون ہونے میں کسی کو شک و شبہ نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا واضح فرمان ہے کہ داڑھیاں بڑھاؤ۔ پھر خود رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ مبارک پر داڑھی تھی۔ تمام انبیاء و رسل اور اُمت مسلمہ کے مشاہیر علمائے کرام کے چہروں پر داڑھی تھی۔

مسلمان جب مغرب کی غلامی میں آئے تو اپنے آقاؤں کی نقالی بلکہ خوشنودی کی خاطر داڑھی منڈوانے لگے اور اس وفاداری میں اُسوۂ حسنہ کو بھی بھول گئے۔ زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے جہاں قرآن و حدیث سے داڑھی کی اہمیت واضح کی ہے وہاں جدید سائنسی تحقیق کے حوالے سے داڑھی کی موجودگی کے فوائد اور اچھے اثرات مضبوط دلائل کے ساتھ درج کر دیے ہیں۔ مصنف نے لکھا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں بھی داڑھی رکھنے کا حکم موجود ہے۔

ہر عظیم قوم اپنے وجود اور پہچان پر فخر کرتی ہے۔ مسلمانوں کے گروہ کی پہچان یہ ہے کہ اس کے مردوں کی داڑھیاں ہیں اور عورتوں کی پہچان ان کا باپردہ ہونا ہے۔ مسلمانوں کو اطاعت رسول کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے۔ پس رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت کا تقاضا ہے کہ آپ کی سنت کو اپنایا جائے اور اسے ہلکا سمجھ کر نظر انداز نہ کیا جائے۔

یہ چھوٹی سی کتاب اپنے موضوع کا بخوبی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دلائل مضبوط اور حوالے مستند ہیں۔

کوئی سلیم الطبع مسلمان اس کو پڑھ کر داڑھی کے بغیر نہیں رہے گا۔
کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں موجود ہیں۔ یہ اغلاط اگلے ایڈیشن میں درست کر لینی چاہئیں۔

(۳)

نام کتابچہ : سبدگل
مصنف : ڈاکٹر عبدالمقیت شاکر علیمی
ضخامت:264 صفحات سال اشاعت:2007ء قیمت: درج نہیں
ملنے کا پتہ: رہبر پبلشرز اردو بازار کراچی

بڑا خوش نصیب ہے وہ شخص جس کو صالحین کی صحبت میسر ہو۔ بزرگوں کی صحبت سے وہ عقدے حل ہو جاتے ہیں جو بڑے پیچیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ صحبت کے اثر کا کوئی انکار نہیں کرتا۔ نیکوں کی صحبت نیکی کے راستے پر لگا دیتی ہے' جبکہ بروں کی صحبت انسان کو گناہوں اور برائیوں کی طرف لے جاتی ہے۔ ہمارے بزرگ اکثر اپنے شاگردوں اور پیاروں کو بڑے آدمیوں کے سوانح حیات پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے مصنف بھی ان خوش بخت لوگوں میں سے ایک ہیں جنہیں صالحین کی صحبت میسر آئی اور انہوں نے ان نیک اطوار ہستیوں سے بہت کچھ سیکھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ انہوں نے مناسب جانا کہ دوسرے لوگ بھی ان بزرگوں کے کردار و عمل اور عادات و اطوار سے واقف ہوں' نصیحت حاصل کریں' سبق سیکھیں اور اچھی زندگی بسر کریں۔

''سبدگل'' میں ڈاکٹر محمد عبدالمقیت نے تیس سے زیادہ اچھے لوگوں کا تذکرہ کیا ہے جن کی صحبت انہیں میسر آئی اور جن کے کردار و عمل نے انہیں متاثر کیا۔ ویسے تو یہ سب لوگ ہی بڑے مقام و مرتبہ کے حامل ہیں' تاہم مولانا محمد یوسف کاندھلوی' شاہ عبدالعزیز رائے پوری' مولانا عاشق الٰہی بلند شہری' احسان دانش' مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی اور پروفیسر عبدالمغنی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر میں انہوں نے اپنے والد گرامی اور والدہ محترمہ کا بھی ذکر کیا ہے جنہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

یہ کتاب خاص طور پر نوجوانوں کے مطالعہ کے لیے از حد مفید ہے۔

Al-Baqarah

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيم

Introduction

As described in the introduction of the Qur'an, the *surahs* are divided into two categories, *Makkan* and *Madinan.* These are further sub-divided into groups of *surahs* forming pairs. The first *surah*, *Al-Fatihah* was revealed at *Makkah*. The first *Madinan* part, starting from this *surah*, consists of four *surahs* in two sub-divided groups. The first group consists of *Al-Baqarah* and *Aal-e-Imran*, with *An-Nisa* and *Al-Maidah* forming a pair in the second group.

The first surah of the Madinan group, Al-Baqarah, is the largest surah and comprises nearly two and a half ajza of the Qur'an. It has 286 ayaat divided into forty ruku's and is the most important surah of the Qur'an, as has been quoted in a Hadith:

> *"Everything has a peak, and Al-Baqarah is the peak of the Qur'an."* [1]

And we can say that every phenomenon has a climax and the climax of the *Qur'an* is *surah Al-Baqarah*. This *surah* can also be called '*Surat-ul-Ummatain'*, the *surah* of two *Ummahs*, because it discusses the present Muslim *Ummah* as well as the former Muslim *Ummah i.e. Children of Israel*.

The *Madinan* phase started with the *Hijrah*, and this *surah* was the first to be revealed in this phase, with almost two third of the Qur'an having already been revealed at *Makkah*. It was revealed gradually, step-by-step, in a seventeen month time period between the start of *Hijrah* and the battle of *Badr.*

Surah Al-Baqarah can be divided into two nearly equal parts according to its subjects. The first part comprises 152 *ayaat* and eighteen *ruku's*, while the second part consists of 134 *ayaat* and twenty-two *ruku's*.

The first part addresses the former Muslim *Ummah*, *Bani Israel (Children of Israel)* who, like the Muslims, were acquainted with the Unity of Allah, Prophethood, Revelation, the Hereafter and the Angels. Nearly ten *ruku's* out of eighteen in this part, starting from the 5th *ruku'*, address *Bani Israel*.

As this *surah* was the first to be revealed at *Madinah* and has been placed by Allah in the very beginning of the Qur'an, its first four

ruku's are a summary of the *Makkan Qur'an*, with the first two *ruku's* describing the philosophy of the *Qur'an*, while the third and the fourth, narrating the position of man in this universe, the basis on which he was raised to the position of *Vicegerency*, the struggle between the forces of good and the forces of evil, and the struggle of man with his own self and the forces of *Satan*. The remaining four *ruku's* of this part discuss the shifting of the *Qiblah* from *Jerusalem* to *Makkah*. *Jerusalem* was the center of attention of the *Jews*, the former Muslim *Ummah*, for nearly two thousand years, and was of great significance to them, but the substitution of *Jerusalem* with *Ka'bah* [2] led to the removal of *Bani Israel* from their position as a Muslim *Ummah* and their replacement by the *Ummah* of Prophet Muhammad (SAW).

The second part addresses the present Muslim *Ummah* exclusively. At *Makkah*, Islam was mainly concerned with the propagation of its fundamental principles and the moral training of the Muslims, and directives regarding obligations and prohibitions, other than *Salah*, were not issued. But in *Madinah*, after the *Hijrah*, the Islamic *Sharia'h* (The code of law derived from the Qur'an and from the teachings and actions of Muhammad (SAW)) started being revealed. Allah (SWT) issued directives regarding social, cultural, economic, political and legal matters. Firstly these directives, which continued in *surah An-Nisa* and *surah Al-Maidah*, included the obligations like *Zakah* (obligatory charity) and *Siyam* (fasting), and prohibition of drinking alcohol and consuming *Riba*; secondly they discussed matters like *Jihad*, *Infaaq* and *Qitaal* in the cause of Allah.

The *Tafsir* (exegesis), of an *ayah* is not possible without occupying oneself with its contextual background and the explanation of the reasons of its revelation, because various *ayaat* were revealed in relation to a particular time in history and certain circumstances. Therefore, for a fuller understanding of the revelation and in order to know whether it has a specific implication for the particular occasion it was connected with or is of a general nature and needs to be applied by all Muslims at all times, some special knowledge of the circumstances that surround the message is also necessary.

Translation and Brief Elucidation

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

"In the name of Allah, the most Benevolent, the Most Merciful."

الٓمّٓ ①

(1) *Alif Laam Meem.*

These letters are known as *al-huruf-ul-muqatt'aat.* They are fourteen in number and appear in the beginning of twenty-nine *surahs* of the *Qur'an.* Although many opinions have been raised about these letters, the general consensus is that these are among the things, the knowledge of which Allah has kept with Himself exclusively. Some of these *surahs* begin with a single letter like *Qaaf*, while others with two, three or four letters, with *surah Maryam* starting with five letters, viz. *'Kaf-Ha-Ya-Ain-Suad'*.

ومب ۚ فِیۡہِ ۚ ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ ②

(2) *There is no doubt in this Book; in it is guidance for the righteous.*

This Book is based wholly on truth and there is no doubt that it is a revelation from Allah, and nothing contained in it can be subject to doubt. It is guidance for those who have *Taqwa*. The word *Taqwa* is generally translated as the fear of Allah or piety or righteousness, but its actual meaning is to save oneself— to save oneself from the Hellfire and from the displeasure of Allah. The *Muttaqun* are those who want to save themselves from all sorts of evil, and have a moral sense within them which becomes manifest in their urge to search for the truth. This urge of theirs is depicted by the prayer in *surah Al-Fatihah*: *"(O' Allah!) Guide us to the Straight Path"*. This *surah* begins with the answer to that prayer: *"There is no doubt in this Book; in it is guidance for the righteous"*, meaning that the guidance they were asking for is this Book.

Although this *Qur'an* is guidance for all humanity, only those who want to guard themselves against evil and have the urge to search for the truth can benefit from its guidance. On the other hand, a person who does not have the urge to save himself from evil is incapable of deriving any benefit from the guidance of the *Qur'an*.

الصَّلٰوۃَ وَمِمَّا رَزَقۡنٰھُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ③

(3) *Those who believe in the Unseen and establish prayer and spend out of what We have provided them.*

Another quality of the *Muttaqun* is that they believe in the Unseen i.e. they believe in the existence of what is beyond the reach of

human perception and know that the ultimate reality lies beyond the realm of their senses. One of the most famous sages in ancient China was a wise philosopher named Confucius [3] who said,

'There is nothing more real than what cannot be seen and there is nothing more certain than what cannot be heard'.

Al-Ghayb (The Unseen) denotes all those phases of reality which are hidden from man's senses and are beyond the scope of human observation and thinking. According to the *Qur'an,* the people who believe in this Unseen reality are the ones who can really benefit from its guidance. On the other hand, it will remain a closed Book for those, the minds of whom cannot accept this fundamental premise.

Another trait of the *Muttaqun* is that they establish *Salah*, which enables them to stay in contact with their Lord, and spend out of the bounties Allah has bestowed on them to earn His pleasure; this includes spending in charity, to spread the message of Allah and to make the Deen of Allah supreme. This means that they do not merely proclaim their faith verbally, but also prove it by practical obedience to Allah.

يؤمنون بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك وبالآخرة هم يوقنون ﴿٤﴾

(4) *And those who believe in what has been sent down to you (O Muhammad) and what was sent down before you, and about the Hereafter they have conviction.*

They believe in what has been revealed to Muhammad (*SAW*) and also all the previous Scriptures (*Torah*, *Injeel* and *Zabur etc.*)[4]. And about the Hereafter, they dhave unflinching certitude. The word used here is يُوقِنُون (*Yuqinun*), which depicts that they not only believe in the *Hereafter* but are deeply convinced that the worldly life is not their only life and that the real life is that of the Hereafter. They have the conviction that they will be resurrected and held accountable for their deeds and that an end to this earthly life will be a beginning to an eternal life.

أولئك على هدى من ربهم وأولئك هم المفلحون ﴿٥﴾

(5) *They are on the guidance from their Lord and they are the ones who will be successful.*

Those who believe in *Al-Ghayb*, establish *Salah*, give *Zakah*, believe in Prophet Muhammad (*SAW*), the Qur'an, and all the other Heavenly Books and Messengers, and are convinced about the Hereafter, are the ones who are on true guidance and will be successful.

As described in the introduction, the *Tafsir* of an *ayah* depends upon the reasons and circumstances of its revelation, which clarify

whether it has been revealed for a specific event or contains a general meaning or has both implications. Here we see that this *ayah* specifically describes the characters and beliefs of the Prophet's Companions like *Abu Bakr*, *Umar*, *Usman* and *Ali* (May Allah be pleased with them all), who were trained and taught by Muhammad (SAW), the greatest teacher in all Mankind. And in general, this *ayah* means that any person who believes in *Al-Ghayb*, establishes *Salah*, gives *Zakah*, believes in Prophet Muhammad (SAW) and all the Divine scriptures and Messengers, and is convinced about the Hereafter, will attain the true guidance of the *Qur'an*. These qualities are prerequisites to tread on the path towards the understanding of the *Qur'an*.

Three types of people have been described in the first two *ruku's*. Firstly those who are on true guidance from their Lord, secondly those who have denied the truth, and finally, the hypocrites. We have already discussed the traits of the believers. In the following *ayah*, the behavior of a disbeliever has been described.

هم ا م لم تنذرهم لا يؤمنون ⑥

(6) *Verily those who have disbelieved, it is equal to them whether you warn them or warn them not; they are not going to believe.*

This *ayah* describes those people who have decided to deny the truth and do not believe in the *Unseen* or in the *Hereafter*. It does not have a general implication, because even after the revelation of this *ayah*, many *Kuffaar* embraced Islam. It refers to a particular group of people, who kept on rejecting the truth for twelve years of preaching of the Prophet (SAW) at *Makkah*. They had known that the message of the Qur'an was the truth but did not want to accept it because of sheer arrogance.

بصارهم غشاوة ولهم عذاب عظيم ⑦

(7) *Allah has put a seal on their hearts and their hearing, and there is a covering on their sights; and for them is a massive torment.*

Because of their arrogance and constant denial of the truth, Allah has put a seal on their hearts and hearing, and a covering on their sights. As a result, they can neither see the guidance, nor listen to and comprehend it. The Prophet (SAW) preached these people for more than twelve years; they were so close to guidance, yet so far. They knew that what Muhammad (SAW) was teaching was the truth; yet they not only denied it but also barred others from the path of Allah. For such people, Allah says that He has put a seal on their hearts as a punishment for their disbelief. But this does not mean that their disbelief is a consequence of Allah's

sealing their hearts. Instead, Allah seals and closes their hearts and ears as a consequence of their denying the truth. And a grievous punishment and suffering awaits them.

We have already mentioned that the first four *ayaat* describe the *Muttaqun,* while the next two describe the disbelievers. Afterwards, Allah describes the hypocrites who avow their belief and hide their disbelief.

وَبِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَمَا هُم بِمُؤْمِنِينَ ﴿٨﴾

(8) *And among the people there are some who say: "We believe in Allah and the Last Day", yet they are not believers.*

Soon after the victory awarded by Allah to Islam and its followers in the Battle of Badr, an Islamic state started to emerge. When the message of Islam reached the hearts of the people of *Madinah*, quite a few Jews and others pretended to be Muslims, whereas in reality, they were liars who had hatred for Islam and Prophet Muhammad (SAW). The Jews used to proclaim that they believed in Allah and the Hereafter, just like the Muslims did, but they had hatred for the Prophet (SAW). So Allah says that these hypocrites utter false statements from their tongues, while in reality they are not believers. Allah revealed *surah Munafiqun* and *surah Taubah* about the hypocrites of *Madinah*. He also mentioned them in *surah Qitaal* when the hypocrites who had enmity in their hearts demanded a *surah* to be revealed for Qitaal [5] and did not want to obey the Messenger of Allah. These hypocrites emphasized their belief in Allah and the Hereafter when it was not the case. This is the specific implication of this *ayah*, but generally this *ayah* refers to all those who have traits like those of the hypocrites.

Whenever there is a revolutionary movement, three types of people always emerge; people who accept that ideology, those who reject it and fight tooth and nail against it, and a third group which neither shows acceptance nor rejection and waits and sees which direction the wind blows. These are the hypocrites, whose deeds are different from what they show and what they utter is different from what they have in their hearts.

يُخَادِعُونَ اللَّهَ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٩﴾

(9) *They (try to) deceive Allah and those who believe. Yet they do not deceive anyone but themselves and they do not perceive.*

The hypocrites think that their outward belief would help them with Allah and that they would save themselves and mislead Allah and the believers by what they utter, but in reality, they deceive themselves without being aware of it.

رلِهِم ههمرض فزادهم الله مرضا ولهم عذاب اليم بما كانوا يكذبون ⑩

(10) *In their hearts is a disease; so Allah has increased them in their disease and for them is a painful torment because of the lies they have been telling.*

This disease is the disease of deception and doubt which goes on to develop into *Nifaaq* [6] (hypocrisy), which is among the gravest of sins and causes a person to reside in the Hellfire forever. And Allah increases their disease i.e. their deception and their shameful behavior. This has always been the *sunnah* (way) of Allah; if a person is a believer and follows the right path, Allah makes that path easy for him, but if he is a hypocrite or a disbeliever and follows the footsteps of Satan, Allah makes his wrong deeds seem good to him and leaves him groping blindly in darkness. Such people will face a grievous punishment for lying to be believers, whereas in reality they do not believe.

We have already mentioned that three types of people emerge whenever there is a call to a revolutionary movement. The people of the third kind are those who neither accept the call nor reject it; instead, they try to make peace between the believers and the disbelievers, between good and evil, between truth and falsehood, because a clash between truth and falsehood results in bloodshed and loss of lives and property. They want to make peace not for the sake of the truth but only to save their own skins. They know that if they have to fight against the disbelievers, they will have to spend out of their wealth and even lay down their lives in the cause of Allah. They do not want to follow the Commandments of Allah and his Messenger, and want to make friends with the believers as well as with Allah's enemies.

ر ض قالوا انما نحن مصلحون ⑪

(11) *And when it is said to them: "Do not create disorder in the earth", they say: "We are but reformers."*

The Muslims used to tell the hypocrites to obey every command of Muhammad (SAW) and not create disorder by breaking the discipline of the *Jama'ah* (party) of the Muslims, but they would reply that it was Muhammad (SAW) and the true Muslims who were going to war and thus creating disorder, whereas they wanted peace.

ون ولكن لا يشعرون ⑫

(12) *Be aware! Surely they are themselves the mischief-mongers but they do not perceive.*

This is the decree of Allah about such hypocrites; they are the ones who create disorder on earth, but they don't realize it. This

is because whenever there is a system in a society other than the *Deen* of Allah, there is bound to be *Fasaad* (disorder), even if apparently peace prevails there, because it is in rebellion with the only rightful ruler of the heavens and the earth. To deal with this rebellion, a strong party is needed, and those who weaken that party by breaking its discipline, actually abet the *Fasaad*.

وإذا قيل لهم آمنوا كما آمن الناس قالوا أنؤمن كما آمن السفهاء ۗ ألا إنهم هم السفهاء ولكن لا يعلمون ⑬

(13) *And when it is said to them: "Believe as the people have believed". They say: "Should we believe as the fools have believed?" Be aware! They are themselves the fools, but they do not know.*

When they are told to believe just as the believers like *Abu Bakr*, *Umar* and *Sa'd Ibn Muadh* (May Allah be pleased with them all) have believed, they say that they are not going to believe like these fanatics who have risked their lives and exposed themselves to all kinds of tribulations, have migrated and left their families and their belongings behind, are suffering persecution for Allah's sake and fighting and getting killed in His way. Allah (SWT) declares these hypocrites like *Abdullah Ibn-e-Ubayy*, to be fools themselves, because they do not realize that they are ruining their eternal lives by disobeying Allah and His Messenger.

وإذا لقوا الذين آمنوا قالوا آمنا وإذا خلوا إلى شياطينهم قالوا إنا معكم إنما نحن مستهزءون ⑭

(14) *And when they meet the believers they say: "We believe." But when they are in privacy with their devils, they say: "Of course we are with you; we do but mock."*

The meaning of *Shaytan* in Arabic is rebellious, or the one who is despaired from the mercy of Allah. In this *ayah*, the word *Shaytan* is used for the chiefs of the Jews of *Madinah*. The hypocrites were very close to the Jews of *Madinah* and whenever they met them, they would declare to be with them and would say that they only ridiculed the believers and deceived them by proclaiming their faith in front of them.

الله يستهزئ بهم ويمدهم في طغيانهم يعمهون ⑮

(15) *Allah mocks at them and leaves them increasing in their defiance to wander blindly.*

i.e. it is not they who mock at the believers; instead they are the ones who are mocked at by Allah and will be punished for their evil acts. Further Allah says: *"He leaves them increasing in their defiance to wander blindly"*. This is the *Sunnah* of Allah; He gives them respite and lets them increase in their arrogance and deviation if they do not want to follow the right path.

ر ـ بحر ـ ـت و تجـ ـ ـ ـارـ ـ ت و هـ وـ ـم و وـ مـ ـاكا ـ نو و امـ وهـ و تـ ـدين و ـ ⑯

(16) *These are the people who have purchased error in exchange for guidance. So their trade brought no gain; nor were they rightly guided.*

They were given guidance in the form of the *Qur'an*, but they went further in their misguidance and abandoned guidance. They believed and then disbelieved and bartered guidance with falsehood i.e. preferred deviation to the guidance of the *Qur'an*. But Allah's remark over their trade is that their bargain is of no use to them and that they are not going to be guided, as they have gone too far in *Nifaaq* (hypocrisy). [6]

Allah has cited two similes in the following four *ayaat*. There are two scholarly opinions regarding these similes. One opinion is that both the parables discuss the *Munafiqun* and the different levels of *Nifaaq* in them. The other opinion is that the first simile gives an example of the *Kuffar*, whereas the second one is about the *Munafiqun*. We have already discussed how Allah describes the *Kuffar* (2:6,7) who have gone so far in their arrogance and evil deeds, that Allah has sealed their hearts and their ears. For those disbelievers, Allah says:

و مـ ـاحـ ـو ـ ل ـ ـه ، ذ ـ هـ ـب ـ الله بنـ ـورهـم وتركهـم في ظـلـمـت لا يـبـصـرون ⑰

(17) *Their example is like the example of one who kindled a fire; then when it illuminated all around him, Allah took away their light (their eyesight) and left them in utter darkness, such that they could not see.*

The Arabs could portray this situation very well in their minds, as they used to travel at night because of the high temperatures during the day, and sometimes, when they lost their way in the desert, they would kindle a fire to find their way. At that moment, if a group of people were to lose their eyesight, they would once again find themselves in darkness. The darkness they found themselves in at first, was external darkness i.e. the darkness of ignorance in their society, the fire which illuminated their surroundings was the guidance given by Allah to His Messenger (SAW), and when they decided to turn a deaf ear to it because of their arrogance, Allah (SWT) took away their sights i.e. darkened their inner selves and left them wandering blindly in the darkness of ignorance.

ف ـ هـ ـم و لا ـ يـر ـجـعـو ـ ن ⑱

(18) *(They are) deaf, dumb and blind, so they will not return.*

They will not return to the right path because Allah has taken away their sights, but it is not their eyes, but their hearts that have gone blind.

يجعلون أصابعهم في آذانهم من الصواعق حذر
ط بالكافرين ⑲

(19) *Or like a rainstorm from the sky wherein there is darkness, thunder and lightening. They press their fingers into their ears due to stunning thunderclap for the fear of death. And Allah is encircling the unbelievers.*

Allah (SWT) cites this parable with reference to the hypocrites. The rainstorm refers to the *Qur’an* which was revealed as a blessing to the world, and the thunder and lightning that the rainstorm brings, refers to the trials and tribulations that a revolutionary movement confronts. Allah (SWT) says that he has already encompassed the disbelievers from all sides and they cannot escape His punishment.

مشوا فيه وإذا أظلم عليهم قاموا ولو شاء الله
بصارهم إن الله على كل شيء قدير ⑳

(20) *The lightening almost snatches away their sights; whenever it illuminates for them, they walk therein; but when it brings darkness over them, they stand still. And had Allah willed, He would have definitely snatched away their hearings and their sights. Verily Allah is All-Powerful over everything.*

It means that whenever the hypocrites see the Muslims and Islam being victorious, they come to acquire the share but as soon as the Muslims suffer a calamity, they disassociate themselves from the believers.

Whenever a revolution takes place, it has to face a lot of trials, tribulations and difficulties, and the people involved in that struggle may have to risk their lives, give up their wealth, sacrifice their careers and businesses, in order to succeed in their struggle. But within these people are those, like the hypocrites of *Madinah*, who want to be a part of the struggle but do not want to risk their lives or properties. Whenever the Muslims faced a calamity or were called upon to wage a war against the disbelievers, they would make excuses in order to save themselves from all the trouble. But when Islam and its people became victorious, they started to follow them and make tall claims about their sincerity.

We have already discussed what Allah has revealed for these hypocrites (2:8,9,10). They claim to believe in Allah and the Hereafter, but the truth is that they are liars. And they make friends with the leaders and the elite among Jews, hypocrites and the idolaters who are opposed to Islam and its followers.

Allah (SWT) describes the hypocrites in *surah Al-Hajj* in these words:

“There are some people who worship Allah standing on the verge

of faith (half faith and half disbelief). When such a person is blessed with good fortune he is content; but if he encounters a trial he turns back headlong; thus losing both this world and the Hereafter, which is a clear-cut loss."[7]

As mentioned earlier, the third ruku renders the summary of the call of the *Qur'an*. In the first *ayah* of this *ruku*, Allah (SWT) says, يَاأَيُّهَا النَّاسُ (*O' Mankind*), meaning that this message is not for a particular race or region, but for the whole Mankind. Unlike past Messengers who were sent to their respective people and nations, Prophet Muhammad (SAW) was not sent to a particular tribe, race or set of people, but to all Mankind.

لذين من قبلكم لعلكم تتقون ٢١

(21) *O mankind! Worship your Sustainer, who has created you and those before you, so that you may save yourselves.*

The word used here is *Ibadah*, which means total obedience and submission to Allah (SWT) out of love for Him from the depths of one's heart. A person should worship Allah (SWT) with absolute humility and submissiveness, since this is the sole purpose of the creation of man, as Allah (SWT) says: *"I have not created Jinns and mankind but to worship Me".*[8] All the Messengers of Allah conveyed this very message. Allah (SWT) commands His servants to worship Him alone, as He is their Creator and Sustainer, and He is the one who created those who were before them. A person tends to follow his forefathers' religion and prefers it to the truth when it comes in front of him, but Allah (SWT) refutes this approach and commands all human beings to be bondsmen to Him alone, as their forefathers were but creatures like they are, and were as likely to commit mistakes as they are; therefore instead of following them, they should follow their Creator's commands and worship Him alone, so that they may save themselves from the displeasure of Allah (SWT) and His punishment.

ض من فِراشا والسماء بناء وأنزل من السماء ماء فأخرج به من الثمرات رزقا

فلا تجعلوا لله أندادا وأنتم تعلمون ٢٢

(22) *Who has made for you, the earth, a resting place (or bed) and the sky, a canopy, and sent down water from the sky, then brought forth thereby, out of fruits, provision for you. So do not set up rivals (or equals) with Allah while you know.*

Allah (SWT) is the Creator, the Sustainer, the Owner and the Provider of this life as well as that of the Hereafter. Hence, He alone deserves to be worshipped and no one and nothing is to be

associated with Him. This is the essence of *Tawhid*; there is no deity worthy of worship, except Allah. So obey Him, worship Him and submit yourselves to Him with all humility and sincerity.

تو وو ابيسو و ر ةٍمن ر و مـرث و لِهِم كورِ اد عصِو اِشه ده ودهن ا الله رإن و ك و نـ و تم وو

صـ ا دقين ور ٢٣

(23) *And if you are in doubt about what We have sent down on Our bondsman [Muhammad (SAW)], then bring forth one Surah of its like, and call your helpers other than Allah, if you are truthful.*

The second article of faith is Prophethood (*Risalah)* i.e. to believe in the Messengerhood of Prophet Muhammad (SAW). Here Allah (SWT) says that if you think that Muhammad (SAW) has fabricated the *Qur’an*, bring something similar to it. This is a general challenge to all, especially the Arab disbelievers who were very eloquent in their language, to bring a *surah* even similar to the smallest *surah* of the *Qur’an*. *“And call your helpers other than Allah”* i.e. you may call all the *Jinns* and all humans, including your eloquent poets and orators, to help you, *“if you are truthful”* i.e. the fact is that you do not doubt it; within your hearts, you know that this *Qur’an* is the word of Allah (SWT) and not the speech of a human being, but because of your arrogance and conceit, you do not want to proclaim it.

ةتى ر و ورق و و د و هـرا النـاس و ورالحـ و جـرارة قتـ و لِلـ و كـ ة فـرين ور ٢٤

(24) *So if you cannot do (it), and you can never do (it), then guard yourselves against the Hellfire, the fuel of which will be men and stones; prepared for the unbelievers.*

This statement of the *Qur’an* is a miracle in itself. Every word of the *Qur’an* is unsurpassable; it is true, just and full of guidance. It is not poetry, which only contains self-praise or description of women, horses and alcohol, does not bring any benefit to anyone, and is full of insignificant descriptions and repetitions; instead, it is full of guidance and wisdom. Every word of it brings some benefit, and the more you read it, the more fruitful and beautiful it becomes. Not a single poet, no matter how eloquent in Arabic language, has accepted this challenge and succeeded to date. Even to produce something like *surah Al-Kausar*, the smallest *surah* of the *Qur’an*, is not possible, because Allah (SWT) has declared that the disbelievers will never be able to surpass the eloquence of this *Qur’an*. *“Then guard yourselves against the Hellfire, the fuel of which, will be men and stones; prepared for the unbelievers”* i.e. the disbelievers will be thrown into the Hellfire, along with the idols, made of stones, which they worship instead of Allah (SWT).

[illegible] ﴿٢٥﴾

(25) *And give glad tidings to those who believe and do good deeds that for them are gardens underneath which rivers flow. Whenever they will be given therefrom any fruit as food, they will say, "This is what we were provided before", while they will be given things in resemblance. And for them, therein, will be purified spouses and they will be therein 'eternal residents.'*

After the reference to the belief in Allah and His Prophet, the belief in the Hereafter is being emphasized here. In the preceding *ayah*, an allusion to the Hell was made, whereas this *ayah* mentions the Heaven. *"Whenever they will be given therefrom any fruit as food, they will say, "This is what we were provided before", while they will be given things in resemblance"*. This means that the fruits granted to them will be similar in appearance to those of this world, but as regards their taste, they will be far superior. The three articles of faith viz. belief in Allah and his unity, and obedience to Him in all aspects of life, belief in the Prophethood of Muhammad (SAW) and in the Qur'an, which is the greatest miracle of Allah (SWT), and belief in the Hereafter have been discussed in these *ayaat*, and this is the basic call of the *Qur'an*.

[illegible] ﴿٢٦﴾

(26) *Verily Allah is not ashamed to cite any parable (whether of) a mosquito or of what is above it. As for those who believe, they know that it is the truth from their Lord. And those who disbelieve, say: "What does Allah intend by this similitude?" By it He leads many astray and many He guides thereby towards the right path. And Allah does not lead astray thereby, except the Fasiqun.*

The *Qur'an* employs similes in many places to explain certain truths or to drive home important points of the message, by likening something to another well known thing or describing it in a pictorial manner. For example, it uses similes and metaphors to describe the eternal bliss of Heaven and the terrible agony of Hell, but in this earthly life, no one can form, even remotely, an idea of that bliss or agony. When a simile is to be cited, it does not matter how small or how large it is; what matters is that there should be a logical correlation between that thing and the thing

which it is being likened to. So Allah says that He is not ashamed to quote any example, whether of mosquitoes or of even more insignificant creatures. The believers believe in all these parables, because they know from their *fitrah*[9] that it is the truth from their Lord. *"And those who disbelieve, say: "What does Allah intend by this similitude?" By it He leads many astray and many He guides thereby towards the right path"*. By these parables and by the *Qur'an*, Allah leads those people astray, whose intentions are iniquitous, and guides the *Muttaqun*, who save themselves from evil and are sincere in their intentions. *"And Allah does not lead astray thereby, except the Fasiqun".*[10]

ـو طـ و و ن الله من بعد ميثاقه و يقطعون ما أمر الله به أن يوصل و يفسدون في الارض

هم الخاسرون ﴿٢٧﴾

(27) *Those who break Allah's Covenant after its ratification, and cut off what Allah has ordered to be joined and create disorder in the earth; it is they who are the losers.*

The *Qur'an* relates the event of a covenant which was administered by Allah (SWT) and taken from all the humans. This covenant is called the Primordial Covenant (*'Ahd-e-Alast*), and is mentioned in the following *ayah* of *surah Al-A'araaf*:

> "*When your Lord drew forth from the children of Adam - from their loins -their descendents, and made them testify concerning themselves: 'Am I not your Lord?' They replied, Why not! We do testify.*" [11]

A question arises here as to when and from whom this oath was taken. Apparently, this event took place before the creation of the material realm, that is, in the realm of spirits (*Aalam-e-Arwah*). Allah (SWT) took this covenant from the souls (*Arwah*) of the human beings, before they were sent to the physical world.

The *Fasiqun* are those who put aside this covenant, after their souls have accepted it, *"and cut off what Allah has ordered to be joined"* i.e. the relations which should be respected, like the parents, the offspring, the brothers and sisters, the kith and kin, *"and create disorder in the earth". "It is they who are the losers"* i.e. they will be the losers on the Day of Judgment.

كيف تكفرون بالله وكنتم أمواتا فأحياكم ثم يميتكم ثم يحييكم ثم إليه ترجعون ﴿٢٨﴾

(28) *How can you disbelieve in Allah, even though you were dead and He revived you; then He will make you die, then bring you to life, then unto Him you will be returned.*

A question arises as to the reality of two creations and two deaths. The answer to this enigma lies in understanding that the original creation (*creation ex nihilo*) was that of our souls (before they were aligned with the material body). The realm of the first creation was *Aalam-ul-Amr*, which was created before the creation of the physical realm. This is the realm, which existed before the *Big Bang*. It was at that time that the *Primordial Covenant* took place, and thereafter the souls were put to sleep. This was the first death. Then, after the *Big Bang*, the material realm came into being. This realm is called *Aalam-ul-Khalq*. Human beings have been created in this realm, with a material body fused with the spiritual soul. This is the first revival of life. When Allah (SWT) causes us to die on earth, it is the second death. When our souls return to Allah (SWT) and are brought back to life in the Hereafter, it will be the second revival.

الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٩﴾

(29) *It is Allah who created for you all that is in earth, then turned towards the sky and made them seven heavens, and He knows everything.*

The Prophet (SAW) said, '*This world has been created for you and you have been created for the Hereafter*', which means that Allah (SWT) has created this universe for man. This subject will be discussed in the next section (*ruku'*) in great detail.

Endnotes

[1] The Hadith was collected by At Tabarani (6:163), Ibn Hibban (2:78) in his Sahih and Ibn Marduwyah.

[2] *Ka'bah*, the central, cubic, stone structure, covered by a black cloth, within the Great Mosque (*Al-Masjid-ul-Haraam*) in *Makkah*, Saudi Arabia. The sacred nature of the site predates Islam. The Holy Qur'an says that the *Ka'bah* was built by *Adam* (AS) and rebuilt by *Ibrahim* (AS) and the descendants of *Nooh* (AS). Also known as the *House of God*, it is the center of the circumambulations performed during the *Hajj*, the Pilgrimage, and it is toward the *Ka'bah* that Muslims face in their prayers. Around the *Ka'bah* is a restricted area, *haram*, extending in some directions as far as 12 mi, into which only Muslims may enter.

[3] Confucius (circa 551-479 BC). He sometimes went by the names Kong Zi though he was born - Kong Qiu - styled Zhong Ni. He was born in the village of Zou in the country of Lu. This Chinese man was a well-known leader in philosophy and he also made many wise phrases and theories about the law, life, and the government. [Encyclopedia Britannica]

[4] The scriptures that Allah mentions in the Qur'an are as follows:
1. The Scrolls that were revealed to *Ibrahim* (AS)
2. The Torah that was revealed to *Musa* (AS)

3. The Psalms that were revealed to *Dawood* (AS)
4. The Gospel that was revealed to *'Isa* (AS)
5. The *Qur'ân* that was revealed to *Muhammad* (SAW) and has been preserved to this day in its original form.

[5] The believers were asking: "Why is not a surah revealed allowing us to fight?" But when a decisive surah carrying the order of allowing them to fight is revealed, you saw those in whose hearts was a disease looking at you like the one under the shadow of death. Woe to them! (Surah Muhammad, ayah 20).

[6] *Nifaq* means to show belief and conceal evil. Ibn Jurayj said of the hypocrite that, "His actual deeds are different from what he publicizes, what he conceals is different from what he utters, his entrance and presence are not the same as his exit and absence." (Tafsir Ibn Kathir, Al-Baqarah: 8)

[7] Surah Al-Hajj, 22 : 11.

[8] Surah Az-Zaariyat, ayah 56.

[9] *Fiṯrah* is also associated with Islam and being born as a Muslim. This is when *fiṯrah* is viewed in respect to *shahadah* – that there is no god but Allah and that Muhammad is the Messenger of Allah – which makes a person a Muslim. *Fiṯrah*, in this sense, is the faculty, which He has created in mankind, of knowing Allah. It is the natural constitution with which the child is created in his mother's womb, whereby he is capable of accepting the religion of truth. Islam is also called *din al-fitrah*, the religion of human nature, because its laws and its teachings are in full harmony with the normal and the natural inclination of the human *fiṯrah* to believe in and submit to the Creator. Furthermore, since this *fitrah* comes from Allah, it naturally follows that only laws capable of guiding man back to it must also come from Allah.

[10] *Fasiqun*: singular *Fasiq*, means transgressor, disobedient, rebellious in nature, one who trespasses the limits set by Allah.

[11] Surah Al-A'raaf 7 : 172.

γ γ γ